ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

فروری ۲۰۲۲ء | جلد نمبر ۱۳ | شمارہ نمبر ۸ | جمادی الثانی۔ رجب المرجب ۱۴۴۳ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی

(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- مولانا محمد قمرالزماں ندوی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا مجیب الرحمن عتیق ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9808850029

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by, MD Hifzur Rahman Nadwi , Mob No 9528097025

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	نسلِ نو کے ایمان کی فکر کریں	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	اپنی قیادت، منصوبہ بندی اور ترجیحات	مدیر	۳
۳۔	قرآنیات	قرآن مجید ایک لازوال کتاب	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۸
۴۔	تحقیق وتنقید	اہلِ کتاب کے کفر کے اسباب (قسط-۲)	مولانا محمد غزالی ندویؒ	۱۴
۵۔	// //	امام شافعیؒ: مستشرقین وناقدینِ مستشرقین کی نظر میں	ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل	۲۶
۶۔	تجزیہ	تحریک اسلامی-موجودہ صورت حال اور ممکنہ آفاق ومیدان	ترجمہ: محمد فرید حبیب ندوی	۳۲
۷۔	// //	ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ-اہمیت اور تقاضے	شبیع الزماں، پونے	۴۱
۸۔	سوانحی مطالعہ	آپ بیتی شیخ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ (آخری قسط)	مولانا طلحہ نعمت ندوی	۴۴
۹۔	علم وتحقیق	حضور پاک ﷺ کی تاریخِ ولادت.....	محمد سہیل ندوی	۵۴
۱۰۔	فکر ونظر	اسلامی تشخص اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۷
	تذکرہ وسوانح	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ.....	مولانا طلحہ نعمت ندوی	۶۳
	شعروادب	غزل	رئیس احمد نعمانی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

اپنی قیادت، منصوبہ بندی اور ترجیحات

آئندہ ماہ جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو ممکن ہے کہ اتر پردیش میں انتخابات کا پہلا دور مکمل ہو چکا ہوگا، بھارت کی قومی سیاست میں اتر پردیش اور بہار کی جو حیثیت ہے اس سے کون واقف نہیں، ۲۰۱۴ء سے ملک جس راہ پر چل پڑا ہے اور معاشرہ جس قدر زہرناک ہوگیا ہے اس کا احساس منصف مزاج غیر مسلم صحافیوں کو بھی ہے، جو وقتاً فوقتاً اس بابت اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں، اس زہرناکی کا سب سے زیادہ مشاہدہ اتر پردیش میں کیا گیا ہے اور آئندہ اس سے زیادہ نقصانات کا اندیشہ مسلّم ہے، لیکن صد حیف پھر بھی ہم ہوش کے ناخن لینے کو تیار نہیں، ہمارے پاس ملک کے موجودہ سیاسی منظرنامے کو دیکھتے ہوئے کچھ پانے کی کوئی امید نہیں ہے لیکن ہم مزید کچھ کھونا بھی نہیں چاہتے، ہم کبھی اپنی قیادت کے وجود وضرورت کے منکر ومخالف نہیں رہے، بلکہ جب سے شعور کی دولت ملی تب سے ہمارا قلم اسی احساس کی آبیاری کررہا ہے، کاش یہ کام شروع ہوگیا ہوتا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم کبھی بھی لفاظی اور بغیر منصوبہ بندی کے محض جذباتی طور پر حصہ داری کا خواب دیکھنے اور اپنی قیادت کا نعرہ لگانے کے قائل نہیں رہے، زمینی حقائق سے آنکھیں موند کر محض جذباتی فیصلوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے، ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں نظریہ بغیر جدوجہد اور عملی سیاست کے کبھی مجسم نہیں ہوسکتا، یعنی بغیر عملی جدوجہد کے محض نظریاتی بحثوں اور تقریروں سے میدان سیاست میں جگہ نہیں بنائی جاسکتی۔

جو لوگ حصہ داری کی بات کرتے ہیں انھیں اچھی طرح ہوم ورک کرنے کی ضرورت ہے، محض خواہشات اور تقریروں کے سبب قیادت نہیں ملا کرتی، اگر کسی قوم کو قیادت میں حصہ داری کے لیے سال دو سال کی محنت درکار ہے تو مسلم قوم کو پوری یکسوئی اور منصوبہ سازی کے ساتھ دوگنی اور سہ گنی مدت درکار ہے، اس لیے کہ ساری ہی قومیں ہمارے خلاف ہیں، بحیثیت مسلم ہماری بالا دستی کسی کو قبول نہیں، دلت مسلم اتحاد کا نعرہ خوب لگایا جاتا ہے، لیکن ہم تجربہ کر چکے ہیں کہ دلتوں کو اگر شبہ بھی ہوجائے کہ کسی طرح باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں چلی جائے گی تو وہ کنارہ کشی اختیار کرلیں گے، پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ آزاد بھارت کی تاریخ میں مسلم مجلسِ مشاورت سے زیادہ طاقت ور سیاسی قیادت مسلمانوں میں نہیں ابھری، اُس عہد کے تمام بڑے بڑے نام اسکے سرپرستوں میں شامل تھے، لیکن حشر کیا ہوا اور کیوں ہوا اور کامیابی کس قدر ملی تھی، ان سوالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیے بغیر جذباتی فیصلے مزید الگ تھلگ کرنے کے سوا کچھ نہیں کریں گے، عام طور پر حصہ داری کا نعرہ لگانے والے یہ سوال کرتے ہیں کہ

سیکولرزم کا مکھوٹا لگانے والوں نے آج تک ہمیں کیا دیا؟ سب سے پہلی بات اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ ہماری سب سے پہلی غلطی یہ رہی کہ ہم نے سیکولرزم وکمیونلزم کو بنیاد بنا کر اکثریت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طبقے کو اپنا دشمن بنالیا، حالانکہ دونوں کی ہی کوشش ہمیں حاشیہ پر لانے کی تھی، دوسری غلطی یہ تھی کہ اگر انھوں نے دیا نہیں تو ہم نے لینے کے لیے کبھی کوئی منصوبہ بھی تو نہیں بنایا، ہمارے یہاں خود سپردگی اور مفاد پرستی کا طرز عمل جاری رہا اور جاری ہے، کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی ادارے یا کسی تنظیم نے سیاسی حصہ داری کے لیے افراد سازی کر کے لوگوں کو میدان سیاست میں ایک وژن (VISION) کے ساتھ اتارا ہو، اور نہ ہی یہ ہوا کہ ملت کے سیاہ سفید کے مالک ایک میز پر بیٹھے ہوں اور انھوں نے کسی پارٹی کی مشروط حمایت کے لیے ایجنڈا تیار کیا ہو اور پھر ملی مفاد میں سیاسی جماعتوں سے بات چیت کی ہو، حصہ داری کا نعرہ لگانے والوں کو ۱۸ سے ۲۰ فیصد مسلمان کا عدد تو نظر آتا ہے مگر یہ نہیں نظر آتا کہ بغیر زمینی تیاری اور کیڈر بیس سیاست اور سالہا سال کی محنت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، کاشی رام اور ملائم سنگھ والی محنت اگر کسی مسلم لیڈر نے اپنی قیادت کو وجود بخشنے کے لیے کی ہو تو اس کا نام ضرور سامنے آنا چاہیے، ہاں مسلم لیڈران شعلہ بار لفاظی کے ذریعہ ضرور میدان مارنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر نصیب یاوری کر جائے تو پھر ملی مفادات کو اپنے مفادات کے لیے قربان کر آتے ہیں، اس سے آگے بڑھیے تو یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا ووٹ متعدد وجوہات کی بنا پر تقسیم ہوتا ہے، سوچنے کی بات ہے کہ آپ ۱۸/ فیصد ووٹ کا نعرہ لگا کر ڈپٹی سی ایم کی کرسی مانگتے ہیں، اور صورت حال یہ ہوتی ہے کہ یہ ۱۸/ فیصد مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہوتا ہے، کسی ایک منتر و وظیفہ کے ذریعہ اس تقسیم کو روکا نہیں جا سکتا کیونکہ کچھ نہ کچھ تقسیم وتنوع تو فطری امر ہے۔ ایک ہی سیٹ پر کئی کئی مسلم امیدوار ہوتے ہیں، مسلکی تقسیم بھی ووٹ کی تقسیم کا سبب بنتی ہے، ذات پات کا جن بھی بوتل سے باہر آتا ہے، اور ایک بڑا طبقہ صرف اپنے مفادات کی خاطر ووٹ کرتا ہے، اسے ہندو مسلم سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، اسے صرف یہ نظر آتا ہے کہ فلاں کے جیتنے سے میرا فلاں کام ہو جائے گا۔ بھارت کی سیاست میں حصہ داری میں آپ تب ہی کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ آپ نظریاتی بنیادوں پر افراد سازی کے عمل میں کامیاب ہوں، اور پھر چھوٹے انتخابات سے ابتدا کر کے اوپر آنے کی کوشش کریں، جب آپ قوم میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں مکمل کامیاب ہو جائیں، جب آپ اس لائق ہو جائیں کہ جس طرح یادو، کرمی اور چمار آپ کے ووٹ کو حاصل کر کے اقتدار تک پہنچ گئے اسی طرح آپ ان کا ووٹ حاصل کر کے اقتدار تک پہنچ جائیں، اور ان کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے آپ کا سیاسی شعور و منصوبہ بڑا ماہرانہ اور پیشہ ورانہ ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر کوئی بھی مسلم سیاسی جماعت محض مسلم ووٹ کی طاقت سے پورے اتر پردیش میں ۲۰/ نشستیں بھی نہیں جیت سکتی، اور بفرض محال اگر خالص مسلم مسلم کی رٹ لگانے والی جماعت ۲۰/ نہیں ۵۰/ نشستیں جیت جائے تو بھی اس کو حکومت سازی کرنے والی جماعت اپنے اتحاد کا حصہ نہیں بنائے گی خواہ دوبارہ انتخاب کی نوبت آجائے، اور دوبارہ انتخاب کی صورت میں سب سے بڑی پارٹی کو عوام کی مکمل حمایت حاصل ہوگی اور مسلم جماعت کی جیتی ہوئی نشستیں مزید کم ہو جائیں گی، بھارت جیسے ملک میں مذہبی بنیاد پر سیاسی شعلہ باری علٰحیدگی پسندی کا ثبوت ہے جو کسی صورت میں کسی بھی طرح سے درست نہیں، اس طرز سیاست سے علٰحیدہ ایک خطہ زمین تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن تکثیری سماج میں حصہ داری نہیں حاصل کی جا سکتی، بھارت کی سیاست کے بارے میں یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ یہاں سیکولرزم کبھی رہا

ہی نہیں، کوئی سیکولر نہیں الا ماشاء اللہ، یہاں سب موقع پرست ہیں، ہمیشہ موقع پرستی کی بالادستی رہی ہے، سیکولرزم کے نام پر اپارچنزم (OPPORTUNISM) کی حکمرانی رہی ہے، مسلمانوں کی بھول رہی ہے کہ وہ سیکولرزم کی حقیقت کو سمجھے بغیر تنہا اس کی حفاظت کا ٹھیکہ لیے رہے اور اس کو بچانے کا دم بھرتے رہے، لوگ انھیں ہندو راشٹر کی تعمیر سے ڈراتے رہے اور وہ اپارچنزم کے فریب کو سمجھ ہی نہیں پائے، یوں تو مسلمانوں کے سفید پوشوں اور کھدّر دھاریوں میں بھی بڑے بڑے موقع پرست (OPPORTUNIST) ہوئے ہیں مگر من حیث القوم مسلمان کبھی بھی موقع پرستی یعنی اپارچنزم کو استعمال کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، جبکہ دیگر کئی قومیں اسی کا استعمال کر کے اقتدار تک پہنچ گئیں۔

موجودہ منظر نامہ میں ہندتوا بھی اپارچنزم کا ایک حصہ ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ بی جے پی نے تمام سیاسی جماعتوں کو خود کو ہندو ثابت کرنے پر مجبور کر دیا ہے، سیکولرزم ولبرلزم وسوشلزم کے سبھی علمبردار کسی نہ کسی طرح خود کو ہندو ثابت کر رہے ہیں، پیرایۂ بیان جدا ہوسکتا ہے مگر سکّہ رائج الوقت کا استعمال سب کر رہے ہیں اور اسی کے ذریعہ حصولِ اقتدار کی راہ ہموار کر رہے ہیں، اس تناظر میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ مسلمانوں کا ووٹ موثر تو ہوسکتا ہے لیکن وہ بی جے پی کو ہرانے کا سبب نہیں بن سکتا، بی جے پی اتنی بڑی اکثریت کے ساتھ تب ہی آسکی جب اس کو ہندوؤں نے بلاتفریق ذات برادری ووٹ دیا، وہی اس کو ہرا بھی سکتے ہیں اور ہٹا بھی سکتے ہیں، مسلمانوں کا انتشار یا متحدہ ووٹنگ کا شور ہندوؤں کو ایک بار پھر ہندوازم کے نام پر بی جے پی جیسی پہلی پسند کو ووٹ کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے، بی جے پی کی دوسری بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ساری پارٹیوں کو مسلمانوں سے بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جس کا مشاہدہ لوگ کھلی آنکھوں کر رہے ہیں کوئی بھی ووٹ کے لیے مسلمانوں کو رجھانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے، بدقسمتی سے وقت کی نزاکت وسنگینی کو سمجھے بغیر مسلمان بھی علٰحدگی پسند سیاست کے جھانسے میں آگئے ہیں، اگر یہ سیاست بیس سے پچیس فیصد بھی کامیاب ہوگئی تو مسلمانوں کا ووٹ مزید بے حیثیت ہو کر رہ جائے گا، خود اس وقت مسلم ووٹ کی یہ حیثیت ہوگئی ہے کہ سب یہ سمجھ کر بیٹھے ہیں کہ یہ ووٹ تو ہم کو بغیر مانگے مل کر رہیں گے، کاش مسلمانوں نے موقع پرستی کا استعمال کیا ہوتا، انھیں اس سے فائدہ اٹھانا آیا ہوتا، وہ کسی پارٹی کے دوست اور کسی کے دشمن نہ بنے ہوتے تو آج اس طرح حاشیہ پر بھی نہ کھڑے ہوتے، یوں بھی بھارت جیسے ملک میں اقلیتوں کا موقع پرست ہونا ہی دانشمندی ہے، اس کے نتیجے میں انھیں جینے کا حق (SURVIVAL) کا موقع رہتا، پھر اگر اقلیت دانشمند ہوتی تو وہ اسی دورانیے سے فائدہ اٹھا کر ٹھوس منصوبہ سازی کے ذریعہ نہ صرف اپنی جڑیں مظبوط کر لیتی بلکہ اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا خواب بھی پورا کر لیتی۔

فی الوقت کا منظر نامہ وجود بچانے کا ہے، تشخص کی حفاظت کا ہے، عصمت وعفت کی حفاظت کا ہے، ملک کے جمہوری اقدار اور دستور کی حفاظت کا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس کے تحفظ کا ٹھیکہ صرف مسلمانوں نے لے رکھا ہے؟ جواب یہ ہے کہ آخر دشمن کے نشانے پر اور کون ہے؟ سب سے زیادہ کس کو ستانے پر وہ آمادہ نظر آتے ہیں؟ سب سے زیادہ اپنے تشخص کی فکر اور ضرورت کس کو ہے؟ سب سے زیادہ عدم تحفظ کا احساس جس قوم میں پنپ رہا ہے اسی کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے کہ وہ جمہوریت و دستور کی حفاظت کا سامان کرے، یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ بعض لوگ بڑی شدّ و مد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ بھارت ہندو

راشٹر بننے والا ہے، لیکن میں نے ہمیشہ پوری وضاحت سے یہ بات کہی کہ بھارت منوواد کی حکمرانی والا ہندو راشٹر بننے کا کبھی اعلان نہیں کرسکتا، کیونکہ خود ہندوؤں میں اتنی برادریاں اور اتنے اختلافات ہیں جو ہندو راشٹر کی حمایت کر ہی نہیں سکتے، منوواد کی حکمرانی قبول کر ہی نہیں سکتے، بڑی عیاری کے ساتھ تقریباً ایسے ۷۰ رفیصد لوگوں کو ہندو بنالیا گیا جو آزادی کے بعد پہلی مردم شماری سے پہلے تک ہندو نہیں لکھے جاتے تھے، لیکن ۱۹۵۳ء کی مردم شماری میں انھیں ہندو لکھ دیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ انھیں صرف ووٹ اور فسادات کے لیے ہندو بنایا گیا، ورنہ آج بھی پنڈت ان کے یہاں کھانا نہیں کھاتا، آج بھی صدر جمہوریہ تک کو مندر میں جانے سے روک دیا جاتا ہے، آج بھی خود بی جے پی میں ذات پات کو لے کر جو اختلافات ہیں وہ اب تو سوشل میڈیا سے نکل کر انتخابی موضوعات میں شامل ہوگئے ہیں، کاش مسلم دانشوران ان موضوعات کا فائدہ اٹھا پاتے، خیر عرض یہ کر رہے تھے کہ جب علی الاعلان منوواد کی حکمرانی والے ہندو راشٹر کی بات ہوگی تو یہی ہندو برادریاں علَم بغاوت بلند کریں گی، اس لیے یہ اعلان تو نہیں ہوگا، البتہ مسلم دشمن اور مسلم مخالف ہندو راشٹر پر سب کا اتفاق ہوسکتا ہے، میرے نزدیک ہندو راشٹر کا مطلب ''مسلم مکت'' بھارت ہے، اور اس معنٰی میں ہندو راشٹر بہت پہلے قائم ہو چکا، CAA/NRC احتجاجات کے زمانے میں اسکی تصویریں بھی خوب دیکھی گئیں، جس بری طرح سے مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا اسکی مثال فسادات کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے، دوسرے درجہ کا شہری ہونے کا احساس دلانے میں حکومت نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، بلکہ شاید اگر کرونا دخل اندازی نہ کرتا تو بچی کھچی ساکھ بھی چلی جاتی، بھارت میں فسادات کی ایک طویل تاریخ ہے، لیکن عدم تحفظ، دوسرے درجہ کی شہریت اور بے مائیگی کا جو احساس پچھلے سات سالوں میں پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کوئی جیت بھی جائے تو ہمیں کیا ملے گا؟ پہلی بات یہ ہے کہ ملنے کی امید چھوڑ کر طویل مدتی منصوبہ کے طور پر چھین لینے اور حاصل کر لینے کی سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سوچ کی نشو نما کے لیے کم از کم ایسی حکومت لانے کی ضرورت ہے جو زبان و قلم پر قدغن نہ لگائے، جو زخم ہی دے مگر زخم پر مرہم کے بجائے نمک نہ چھڑکے، جس میں برائے نام ہی شرم و لحاظ اور احساس جوابدہی ہو، جس سے مل کر اپنی بات کہی جا سکے، جو کم از کم بات تو سنے خواہ ٹال دینے کے لیے سنے، جو روزانہ زبان کے زخموں سے ہمارا کلیجہ نہ چھلنی کرے، جو کم از کم ہمارے کمزور و غریب طبقے کو کھانے کمانے دے، جو دستور کی تبدیلی کا منصوبہ نہ بنائے خواہ عملاً دستور پر عمل پیرا نہ ہو، اگر یہ ماحول مل جائے تو پھر ذمہ دار قوم کی ذمہ داری ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا منصوبہ بنائے، ہم نے اوپر واضح کر دیا کہ حصہ داری اور اپنی قیادت کے وجود کے لیے کن امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، فی الوقت کی ترجیحات میں سب سے پہلی ترجیح یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے ووٹ تقسیم نہ ہوں، ہمارے صوبے میں ایک ایسی حکومت آئے جو بی جے پی جیسے عزائم نہ رکھتی ہو، جو عملاً ایسا بھارت تعمیر کرنے کی حمایت نہ کرے جس بھارت میں مسلمان پریشان ہو، دوسرے درجہ کا شہری ہو، احساس کمتری کا شکار ہو، کیونکہ میری معلومات کی حد تک بی جے پی کے علاوہ کوئی بھی سیاسی جماعت اس طرح کی اشتہاری مہم نہیں چلاتی کہ فلاں کی حکومت بناؤ تو ان مسلمانوں کو پاکستان بھیج دیا جائے گا، پھر ان کی جائیداد تمہارے درمیان تقسیم کر دی جائیں گی، ۲۰۱۴ء اور ۲۰۱۷ کے انتخابات میں گاؤں گاؤں یہی تشہیر کی گئی تھی بلکہ بڑے بڑے

مکانات باعتبار مستقبل لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے، یہ سب کانوں سنے اور آنکھوں دیکھے حالات ہیں، یہی وجہ ہے گاؤں کے عوام سارے چھوا چھوت اور ذات برادری کے نظام کو بھول کر ''مودی'' کے عشق میں دیوانے ہو گئے تھے، ان ہی دعووں کی تکمیل کا جھانسہ دینے کے لیے CAA کا ڈرامہ رچایا گیا تھا، یہ جن ان بیچاروں کو فریب دینے کے لیے اب بھی باقی ہے، گرچہ اب بھی وہ نشہ اترا نہیں ہے لیکن برادری واد اور کسان آندولن نیز مہنگائی اور بی جے پی کے اندرونی اختلافات نے بڑی حد تک اس کی ناکامی کی راہ ہموار کی ہے، یہی وجہ ہے کہ بی جے پی سب بھول کر پھر سے رام اور ۸۰ر بنام ۲۰ر کی گھٹیا سیاست پر اتر آئی ہے، موجودہ منظر نامہ میں جبکہ ہر کسی کو اپنے آپ کو دیش بھگت اور ہندو ثابت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو، ایسے بیانات بڑی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں کہ ''ہماری حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں ہوتا، حکومتی مراعات اور اسکیموں سے وہ یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں'' یا یہ بیان کہ ''ملک میں اصل لڑائی گاندھی کی سوچ رکھنے والوں اور گوڈسے وادیوں کے درمیان ہے''، کاش مسلمان اس بیان کو سمجھ پاتے اور خود تماشائی بن کر اسی لڑائی کو ہوا دیتے، ایک کسان نیتا کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس سے پوچھا گیا کہ یوگی جی تو کہہ رہے ہیں کہ متھرا میں بھی مندر بنائیں گے اس نے کہا ''مندر مطلب آستھا بھڑکانا'' پھر اس نے اپنی بات میں توازن پیدا کرنے کے لیے کہا کہ سیاست میں مندر مسجد گرجا اور دھرم کی بات صرف جذبات کے استحصال کے لیے کی جاتی ہے، حکومت کا کام مندر کی تعمیر نہیں اسپتال واسکول کی تعمیر ہے، اس سے آگے بڑھ کر اس نے کہا کہ اب یہ اس کا آخری وقت ہے اور آخری وقت میں ''رام نام ستیہ'' ہی کہا جاتا ہے، پھر اس کے بعد بی جے پی کے کچھ وزیر وایم ایل اے بھی مستعفی ہوئے، اس پورے منظر نامے کو سمجھنے اور غیر جذباتی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، اپنے ووٹ کی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کرنے کی ضرورت ہے، بچکانہ غلطیاں نہ کرتے ہوئے ۸۰ر بنام ۲۰ر کی سیاست کو ناکام بنانے کی ضرورت ہے، جب ماحول سازگار ہو جائے تو پوری تندہی، منصوبہ سازی اور دانشمندی کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلانے اور اپنی قیادت کو کھڑا کرنے کی ضرورت ہے، جوقومیں وقت کی ترجیح کا درست تعین نہیں کر پاتیں، جذبات کی رو میں بہتی ہیں اور درست فیصلے کرنے کے بجائے بے وقت کی شہنائی بجاتی ہیں وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پاتیں، ہانپنا اور تھک ہار کر حسرت وندامت کے ساتھ بیٹھ جانا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

☆☆☆

❑ قرآنیات

قرآن مجید۔ایک لازوال کتاب

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

یہ مضمون دراصل ڈاکٹر سید محمد انس ندوی کی کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' (مشاہدات کی روشنی میں) پر بطور پیش لفظ لکھا گیا تھا۔اس میں قرآن مجید کا بہترین تعارف آ گیا ہے،اس لیے افادۂ عام کے مقصد سے اسے شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

قرآن مجید ایک ایسا جامع کلام ہے جس کی تفسیر و تشریح ساڑھے چودہ سو سال سے کی جارہی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اور کوئی کوتاہی نہیں کی ہے: **مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ**،(انعام ۳۸) مزید فرمایا ہے کہ'' **وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ** (نحل ۸۹) کہ ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب اتاری ہے جس میں ہر شے کی وضاحت ہے، عقائد و احکام ،اخلاق و آداب ،اور ثواب و عذاب سے متعلق ہر بات واضح کردی گئی ہے، چنانچہ مختلف پہلوؤں پر بحث وتحقیق کا سلسلہ جاری ہے جس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں، رہتی دنیا تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا، کیونکہ جب بھی کوئی صاحبِ علم قرآن کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس میں تدبر کرے گا تو اس پر نئے ابواب کھلتے چلے جائیں گے، نئے اسرار ورموز سے واقفیت حاصل ہوگی ، نئے حقائق کا انکشاف ہوگا، قیامت تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا، خدا تعالی نے خود ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کردینے کا حکم دیا کہ اے نبی آپ لوگوں کو بتا دیجیے کہ اگر سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں تو بھی میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوسکتیں، کلمات الٰہی کو لکھنے کے لیے، قدرتِ خداوندی کے عجائبات کو شمار کرنے کے لیے، قدرت وحکمت الٰہی کی نشانیوں کا احاطہ کرنے کے لیے جنس سمندر کو روشنائی بنا دیا جائے اور پھر ویسی ہی مزید روشنائی فراہم کرلی جائے تو بھی احاطہ واستقصا ممکن نہیں۔ **قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا** (کہف ۱۰۹)

قرآن مجید گنجینۂ علوم ہے، علوم وفنون پر مشتمل اشارات وکنایات کا بحرِ ذخار ہے،اس میں بے شمار مجمل اشارے کیے گئے ہیں، بقدر استطاعت لوگ ان اشارات کو سمجھنے اور عقدہ کشائی کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، **وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ.** (ذاریات ۲۰۔۲۱) زمین میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں جو خدا کی قدرت و وحدانیت پر ایمان رکھنے والوں کے ایمان و یقین میں اضافہ کرتی ہیں، اور خود انسان کی تخلیق میں اللہ کی عظمت وقدرت کی نشانیاں ہیں، جو اس کی عظمت وقدرت اور الوہیت و ربوبیت پر دلالت کرتی ہیں، جو بھی خدا کی تخلیق میں غور وفکر کرتا ہے وہ خدا کی تعجب خیز اور حیرت انگیز قدرتِ تخلیق پر حیران وششدر رہ جاتا ہے اور اس کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا

ہے اور پھر وہ یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ پاتا ''فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (مؤمنون ۱۴) کہ اللہ کی ذات بڑی بابرکت ہے جو ہر شے کی بہترین تخلیق کرنے والا ہے، یہ بات اللہ تعالی نے انسانی تخلیق کے مراحل کو اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمائی ہے، جیسے سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۱ میں خدا کی یاد میں مست رہنے والوں اور اس کی تخلیق میں تدبر کرنے والے اہل ایمان کی خصوصیت اس طرح ذکر فرمائی ہے ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ '' کہ خدا کی تخلیق میں تدبر کرنے والے اس کی قدرت کی ہر نشانی کو ایک دلیل کے طور پر دیکھتے ہیں، کائنات کی ہر مخلوق کو خدا کا ایک معجزہ سمجھتے ہیں، ہر شے کو خدا کی قدرت اس کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت کے لئے دلیل ناطق سمجھتے ہیں، وہ جب آسمان وزمین اور فضاؤں میں بکھری ہوئی خدا کی قدرتِ تخلیق کی نشانیوں میں غور و فکر کرتے ہیں تو ڈرتے، کانپتے اور لرزتے ہوئے کہتے ہیں، خدایا ہم گواہ ہے کہ تو نے ان مخلوقات کو بے کار وعبث نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی حکمت کے تحت وجود بخشا ہے، اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔

قرآن مجید ایک زندہ جاوید معجزہ ہے، اس کا اعجاز کل بھی قائم تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اس کو نفوس انسانی کی ایمانی، روحانی، قلبی واخلاقی، فکری ونظریاتی اصلاح کے لیے اتارا گیا ہے، ''هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ '' (بقرہ ۱۸۵) وہ کتاب ہدایت ہے، بشارت ہے، شفا ہے، رحمت ہے، انسان کے عروج وزوال کا سب سے اہم ذریعہ ہے، وہ خدا کا کلام ہے، اس کی الوہیت وربوبیت کی بولتی ہوئی دلیل ہے، وہ اس کی بے شمار دلیلیں فراہم کرتا ہے کہ خدا ہی ہر شے کا خالق ہے، اسی کو تصرف کا حق حاصل ہے، وہی تصرف کرتا ہے، اس کا کوئی شریک وساجھی نہیں ہے، اس نے اس کتابِ تذکیر کی بنیاد علم پر رکھی ہے جس کا اظہار سب سے پہلی وحی میں فرمایا گیا ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ '' میں ''اِقْرَاْ'' یعنی پڑھنے کا حکم دے دیا گیا اور خالق کے تصور واستحضار اور اس کی بالادستی کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا، یہاں مفعول کو ذکر نہیں کیا گیا لیکن خدا کی صفت تخلیق کا تذکرہ کر دیا گیا، اسی سے بعض اہل علم نے یہ استدلال کیا کہ خدا کی ہر مخلوق کو پڑھنا ہے، ہر علم خدا کی ایجاد ہے، علم نافع اور غیر نافع کے سوا کوئی تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی، خود سارے انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے تمام اشیاء کی خصوصیات کا علم عطا فرمایا تھا، اور اسی علم کو انسان کے لیے وجہ فضیلت قرار دیا تھا اور فرشتوں پر برتری ثابت کی تھی۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ ۳۱)

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں: ''آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلومات اشیاء سے لی ہے، اور اسماء کے ساتھ مسمیّات اور ذوات وخواصِ اشیاء کو شامل کیا ہے اور اشیاء کے اسماء سے مراد ان کے آثار وخواص کا علم لیا ہے، گویا سارے علوم تکوینی آدم وبنی آدم کو ودیعت کر دیے گئے'' (تفسیر ماجدی ۱/۱۱۷)

اللہ تعالی نے آدمؑ کو آسمان وزمین کی مخلوقات اور تمام اشیاء کے اسماء وخواص کا علم دیا، تاکہ وہ اس علم کی وجہ سے فرشتوں سے ممتاز قرار پائیں، ظاہر ہے کہ علم کا مرتبہ ہر رتبہ وشرف سے بلند وبالا ہے، پھر علوم میں بھی سب سے بلند مقام اس علم کا ہے جو خدا تعالی کی طرف سے عطا کیا جائے، جیسے اللہ نے آدمؑ کو علم دیا یا جیسے علوم شریعت، جب اللہ تعالی نے آدم کو تمام اشیاء کے اسماء وخواص کا علم دے دیا تو پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تاکہ امتحان وآزمائش کے بعد آدم کی فضیلت وافضلیت اور ان کا اشرف ہونا ثابت ہو جائے، پھر اللہ نے فرشتوں سے کہا اگر تم اپنے اس وعدے میں سچے ہو کہ تم آدم اور ان کی ذریت سے افضل ہو تو چلو ان مخلوقات کے نام بتاؤ۔ اس کے بعد والی آیت میں فرشتوں کا جواب نقل کیا

گیا ہے ، جسمیں انھوں نے اپنی عاجزی کا اظہار کیا اور کہا **قَالُوْا سُبحٰنک لَا علم لنا إلا ما علمتنا إنّک أنت العلیم الحکیم** ، یہاں فرشتوں کے جواب میں خدا تعالی نے اپنی دوصفتوں ''علیم وحکیم'' کا ذکر کیا ہے، اسی سے بعض اہلِ علم نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جس عالم کو علم وحکمت دونوں چیزیں حاصل ہوں وہی درحقیقت عالمِ ربانی ہے ، جس کے اندر یہ دونوں صفتیں نہ ہوں یا ان میں سے کوئی ایک وصف نہ ہو تو پھر دین میں اس کی سربراہی وپیشوائی قبول نہیں کی جاسکتی۔

خدا تعالی نے اس کتابِ تذکیر ونصیحت میں اپنی نعمتوں اور نشانیوں کے ذریعہ انسانوں کی تذکیر کا سامان فراہم کیا ہے، اس سلسلے میں قرآن مجید کثرت سے مشاہداتی دلائل نقل کرتا ہے، کائناتی اور مشاہداتی دلائل کے ذریعہ اتمامِ حجت کرتا ہے، (اس سلسلہ کی متعدد آیات نقل کی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے باعث گریز کیا گیا) ان دلائل کو بھی خدا تعالیٰ لفظ'' آیات'' سے تعبیر فرماتا ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں کہیں قرآنی فقروں کے لیے آیا ہے، کہیں معجزات کے لیے آیا ہے اور کہیں کائناتی حقائق وشواہد اور کائنات میں پھیلے اس کی قدرتِ تخلیق کے بے شمار مظاہر کے لیے، معجزات پر ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں، لیکن قرآنی آیات اور کائنات کی آیات میں غور کرنے کا قرآن مجید نے بار بار حکم دیا ہے اور بار بار اس پر ابھارا ہے، جو لوگ ان میں غور کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں ان کی مدح و ستائش کی گئی ہے بلکہ ان کے بارے میں یہ تک کہہ دیا گیا ہے کہ در حقیقت وہی لوگ خدا سے ڈرنے والے ہیں، اور جو لوگ خدا کی نشانیوں، قرآنی آیات اور آیات کونیہ میں تفکر وتدبر سے جی چراتے ہیں انہیں غافل قرار دیا گیا ہے، ان کی مذمت کی گئی ہے، چنانچہ اگر ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ'' **اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا** '' (محمد۲۴) یعنی کیا یہ لوگ (منافقین) قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اس کے احکامات سے نفع اٹھائیں، اسکی نصیحتوں سے عبرت حاصل کریں اور اسکے دلائل کو سمجھیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں، چنانچہ یہ نہ ہی حق قبول کرتے ہیں اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ہی ان تک ایمان کا نور پہنچتا ہے، دوسری جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے،'' **وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَ ھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ** ''(یوسف۱۰۵) آسمانوں اور زمین میں کتنی ایسی واضح نشانیاں اور روشن دلیلیں ہیں جو اللہ کی عظمت ووحدانیت کا پتہ بتاتی ہیں، جن کو لوگ دیکھتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں لیکن نہ ان میں غور کرتے ہیں اور نہ عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، ہر شے میں اللہ کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کے حسنِ تخلیق کی نشانی ہے، لیکن گناہ وجرائم اور غفلت دلوں کو توحید کی فضا میں سپرد کرنے اور روشنی حاصل کرنے سے روک دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت ارضی کی بنیاد دراصل قرآن و کائنات میں تدبر پر رکھی گئی ہے، اسی لیے تو آدم اور بنی آدم کو تمام علوم ولقب دیے گئے تھے، تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ جب تک مسلمانوں نے آیاتِ قرآنیہ اور آیاتِ کونیہ پر تدبر کرنے میں توازن قائم رکھا تب تک وہ دنیا کی یک قطبی طاقت بنے رہے اور کرۂ ارضی پر ان کی حیثیت ہر سیاہ سپید کے مالک کی رہی، لیکن جب انہوں نے اس توازن کو کھو دیا، علوم میں بے جا تفریق کر ڈالی، سائنسی ایجادات یا یوں کہیے کہ علوم جدیدہ کو اغیار کی ایجاد واختراع کہہ کر ٹھکرا دیا یا ان ہی کو مالک و موجد قرار دے کر ایجادات واکتشافات سے غافل ہو بیٹھے تب سے عروج روٹھ گیا، نشأۃ ثانیہ کی ہر کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی، مجھے ان لوگوں کے نظریہ سے شدید اتفاق ہے جو علوم جدیدہ کو خلافتِ ارضی کی کنجی اور اس کا حق ادا کرنے کا بنیادی ذریعہ سمجھتے ہیں، جو قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھنے کی قطعی غلطی نہیں کرتے، لیکن اسے دلائل ربوبیت کا خزانہ سمجھتے ہیں، اسی فکر اور دعوتی نقطۂ نظر سے قرآن اور سائنسی حقائق کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ

قرآن اور سائنس میں کیا تعلق ہے، قرآن مجید میں سائنسی حقائق کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اوران میں تدبر کی دعوت کو بار بار کیوں دہرایا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت اور جیتا جاگتا معجزۂ الٰہی ہے، تو پھر اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں علوم جدیدہ کے اشارات کا ذکر بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے ہی کیا گیا ہے، اور درحقیقت عہد جدید کے مادہ پرستانہ نظریات اور خالص ملحدانہ فکر ونظر کا مقابلہ بھی اسی نوعیت کے قرآنی فلسفہ سے کیا جا سکتا ہے، اور الحاد کے سیل رواں کو اسی قسم کے قرآنی فلسفہ سے روکا جا سکتا ہے۔ جسمیں منکرین قرآن، منکرین حدیث، علوم جدیدہ کے حامل ملحدین اور غیر مسلموں کے سامنے ان قرآنی حقائق ومعارف کو دعوتی نقطۂ نظر اور عصری اسلوب میں پیش کیا جائے ، یہ کام وقت کی ضرورت بلکہ سب سے اہم ضرورت ہے، اس جانب ندوہ کے گلِ سرسبد علامہ سید شہاب الدین ندوی مرحوم نے توجہ کی تھی بلکہ اپنی پوری زندگی اسی کے لیے وقف کردی تھی، انہوں نے ساری زندگی یہ بتانے میں صرف کی کہ علمی واستدلالی نقطۂ نظر سے ان قرآنی معارف وحقائق سے کون سے دلائل ربوبیت ثابت ہوتے ہیں، عقل وسائنس پر شریعت کی کس طرح بالادستی ثابت ہوتی ہے، قرآن وسائنس میں کیسے تطبیق ممکن ہے، شریعت الٰہی کی معقولیت وحقانیت کو علمی واستدلالی نقطۂ نظر سے کیوں ثابت کرنا چاہیے اور کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے، شریعت وفطرت دونوں ایک دوسرے سے کیسے ہم آہنگ ہیں، سینکڑوں کتابیں لکھنے کے بعد وہ جس نتیجہ پر پہنچے اس کو انہوں نے اپنی کتاب ''میری علمی زندگی کی داستان عبرت'' میں قلمبند کیا ہے، یہاں اس سلسلہ کے دو اقتباسات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ معرض وجود میں آنے والی زیرِ نظر اسی نئی کتاب کی اہمیت اجاگر ہو سکے!

مولانا لکھتے ہیں! ''بہر حال ملت کے ناخدا جب تک اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس ''کڑوے گھونٹ'' کو حلق کے نیچے نہیں اتاریں گے ملت اسلامیہ کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ سائنسی علوم کا تعلق نہ صرف دلیل واستدلال سے ہے بلکہ اس کا تعلق خلافتِ ارض سے بھی ہے اور ان حیثیتوں سے یہ علوم آج اس امت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ڈاکٹر برق نے اس بنیادی حقیقت کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر کے قرآن کو محض سائنس کی کتاب قرار دینے پر اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ حالانکہ قرآن میں سائنسی علوم کا تذکرہ اصلا دلائلِ ربوبیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ہے، جو مظاہرِ عالم میں غور وفکر کے باعث ظہور میں آتے ہیں۔ اور ان مظاہر میں غور وخوض کے باعث جو نیا علم وجود میں آیا ہے اس کا نام سائنس ہے۔ جسے ہمارے قدیم علماء ''تکوین'' (خلق وایجاد) کہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم درحقیقت ''کتابِ ربوبیت'' ہے، جیسا کہ اس کی پہلی سورت کی پہلی ہی آیت کریمہ سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے، جس کے مطابق باری تعالی کو ''رب العالمین'' کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یعنی اس کائنات میں جتنے بھی مظاہر ومخلوقات ہیں ان سب کا رب۔ چنانچہ ربوبیت کی تفصیلات پورے قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کہیں اشاروں کنایوں میں اور کہیں پر کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، جو دراصل دلائلِ ربوبیت کی نوعیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور یہ دلائل (نظام کائنات میں موجود خدا کی نشانیاں) مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں میں پوری طرح سمو دیئے گئے ہیں (کیونکہ خلاق عالم نے انہیں حد درجہ حکمت ومنصوبہ بندی کے ساتھ پیدا کیا ہے لہذا ان دلائل کی تحقیق کے لئے مظاہر کائنات کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ اور اس تفصیلی مطالعے سے قرآن حکیم میں مذکور وہ تمام اشارات وکنایات ''معنی خیز بن جاتے ہیں جو

دلائلِ ربوبیت سے متعلق ہیں''۔اوراس کے نتیجے میں باری تعالی کے''رب العالمین'' ہونے کی حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے، جو ہرقسم کے کفر وشرک اور الحاد ودہریت کے خلاف ایک برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک متن ہے،جس کی شرح وتفصیل یہ پوری کائنات ہے۔اوران دونوں میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے مصدق ومؤید ہیں۔اور ان دونوں کی تصدیق سے ہرقسم کی فکری گمراہیوں کا استیصال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی چشمے سے صادر شدہ ہیں''۔(میری علمی زندگی کی داستان عبرت ص۲۱۔۲۲)

دوسری جگہ علامہ یوں فرماتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ قرآن عظیم میں نئے نئے علوم اور نئے نئے علمی حقائق ومعارف کا جو تذکرہ موجود ہے وہ پوری نوع انسانی کو متوجہ اور خبردار کرنے کی غرض سے ہے کہ صحیفۂ الٰہی کوئی فرسودہ کتاب نہیں بلکہ وہ رب العالمین کی جانب سے نازل شدہ ہے جو اس کائنات کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک بھید سے بخوبی واقف ہے۔اس لحاظ سے اس میں جو علمی حقائق مذکور ہیں وہ دراصل موجودہ الحادی ذہنیت کے توڑ کی غرض سے ہیں کہ مسلمان ان حقائق سے آگاہ ہوکر علمی جہاد کے میدان میں ان کو بطور ہتھیار استعمال کریں۔کیونکہ''لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے'' کے مطابق ہر دور کی ذہنیت کا مقابلہ اس کے ہتھیار سے ہونا چاہئے۔اس لحاظ سے قرآن کی دعوت عصری ذہنیت کے پیش نظر جب تک نئے اسلوب میں اور نئے ہتھیاروں کے ذریعہ نہ کی جائے۔ وہ موجودہ ''عقلیت پسندوں'' اور''سائنس زدہ لوگوں کے لئے بالکل بے اثر رہے گی۔ہر دور کا ایک عقلی مزاج ہوتا ہے جسے نظر انداز کر دینے کے بعد کوئی بھی دعوت یا کوئی بھی تحریک اپنی منزل تک نہیں پہونچ سکتی''۔(میری علمی زندگی کی داستان عبرت ص۳۴)

یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج ایک بار پھر ندوہ کے ایک قابل احترام فاضل ڈاکٹر محمد انس ندوی صاحب کی ایک ایسی ہی علمی کاوش کو پڑھنے اور پھر اسے شائع کرنے کا موقع ملا جو علمی واستدلالی اور دعوتی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے،اگرچہ ان کی یہ کتاب مختلف اوقات میں لکھے گئے متعدد چھوٹے اور متوسط مضامین کا مجموعہ ہے،لیکن اس کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے، کیونکہ تمام مضامین کا موضوع ایک ہی ہے،سب مضامین قرآنی معارف اور سائنسی اکتشافات میں علمی واستدلالی تطبیق کے ذریعہ دعوت فکر وعمل کا دروازہ کھولتے ہیں،قرآن مجید کے علمی وعصری اعجاز پر مختلف موضوعات کے تحت گفتگو کرتے ہیں، یہ کتاب دراصل ربوبیت کے متعدد دلائل کو اختصار وجامعیت کے ساتھ ایک حسین وپرکشش گلدستہ کی شکل میں پیش کرتی ہے،قرآن مجید کی پیش کی ہوئی شریعت کی صداقت وحقانیت اور معقولیت واضح کرنے کے ساتھ خدا تعالیٰ کی تخلیقی قدرت وحکمت کے جلوؤں سے روشناس کراتی ہے،قرآنی علوم ومعارف اور سائنسی حقائق میں تطبیق کے پہلو سے یہ کتاب ایک طرف تو خود قرآن کے طالب علموں کو نئے سرے اور نئے پہلو سے مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہے تو دوسری طرف منکرین خدا اور منکرین قرآن کو دعوتِ ایمان ویقین پیش کرتی ہے، اسی لیے میری نظر میں اس کی افادیت اردو سے زیادہ ہندی وانگریزی میں ہوگی۔

قرآن مجید کے علمی اعجاز پر ہر دور میں کام ہوا ہے،اور عصری تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے کام کیا گیا ہے،موجودہ عہد میں بھی بالخصوص عربی میں "قرآن مجید کے علمی اعجاز'' کو موضوع بنا کر بڑا کام کیا گیا ہے اگرچہ اس سلسلہ کے زیادہ تر کاموں کی نوعیت یہ ہے کہ وہ قرآن مجید میں سائنسی اکتشافات کے تذکرے کی خبر دیتے ہیں،مصنف کتاب نے اپنے طاقتور مقدمہ بعنوان ''قرآن مجید کا علمی اعجاز'' میں متعدد کتب ومصنفین کا تذکرہ کیا ہے،لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری نظر میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کا

منفرد کام علامہ سید شہاب الدین ندوی مرحوم نے کیا ہے، انہیں اس موضوع پر مرجعیت و مرکزیت حاصل ہے، وہ نہ صرف ندوہ کے گل سرسبد تھے بلکہ علومِ اسلامیہ کے شہاب ثاقب تھے، عہد جدید میں ''قرآنی فلسفہ'' اور ''جدید علم کلام'' کے مؤسس و بانی تھے، مجھے خوشی ہے کہ آج بڑی حد تک اسی فکر و فلسفہ کے تسلسل و امتداد کے طور پر ایک اور ندوی فاضل کی کتاب معرضِ وجود میں آ رہی ہے، اس سے قطع نظر کہ دونوں کے کام اور کام کے معیار میں قدرے فرق ہے، لیکن بہر حال یہ ایک نہایت قابلِ قدر کوشش ہے جو بیش قیمت معلومات فراہم کرنے کے ساتھ تفکر و تدبر کی راہ ہموار کرتی ہے۔

کوئی دو برس قبل ''**ندوی فضلاء کی قرآنی خدمات**'' پر مجھے کچھ لکھنے کا اتفاق ہوا تھا، کتاب کی اشاعت کے بعد بعض احباب نے کچھ کتب کے رہ جانے کی طرف اشارہ کیا، کیونکہ میں نے اس کتاب کے لیے یہ معیار طے کیا تھا کہ جن فضلائے ندوہ کی کوئی کتاب یا رسالہ مطبوعہ ہو ان کا اس کتاب میں تذکرہ کیا جائے، ان چھوٹ جانے والے فضلاء ہی میں ہمارے محترم و مشفق اور سینئر ندوی فاضل ڈاکٹر سید محمد انس ندوی صاحب ہیں، جن کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی تھی، میں نے اس کا فوٹو ندوۃ العلماء کے شبلی کتب خانہ سے حاصل کیا، پھر ڈاکٹر صاحب موصوف سے رابطہ کیا کہ آپ اپنے سوانحی خاکہ سے مطلع کیجئے تا کہ اس قیمتی تذکرہ و تبصرہ کو اپنی کتاب میں شامل کر سکوں، ڈاکٹر صاحب کا تعلق الہ آباد سے ہے، ان کی پیدائش ۱۹۵۷ء کی ہے، انہوں نے ۱۹۷۴ میں دار العلوم دیوبند سے عالمیت اور ۱۹۷۵ میں فضیلت کی ہے، ۱۹۷۷ میں ندوۃ العلماء سے تخصص کیا، جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض سے ۱۹۸۳ میں لیسانس کی سند حاصل کی، پھر سعودی عرب کی وزارت برائے مذہبی امور کی طرف سے برطانیہ میں بحیثیت داعی و خطیب تقرر ہو گیا، ۱۹۹۳ میں الہ آباد منتقل ہو گئے اور مدرسہ افضل المعارف میں تقریباً دس سال تدریسی خدمات انجام دیں، اسی دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں، ۲۰۰۳ میں پھر آسٹریلیا منتقل ہو گئے اور اب وہیں تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے ساتھ امامت و خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، میں نے اس موقع پر یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس کتاب کو دوبارہ شائع ہونا چاہیے اور اس کا افادہ عام ہونا چاہیے، استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ آں محترم کی واحد تصنیفی کاوش ہے، جب کہ سچی بات یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر اور اس کے علمی اسلوب اور استدلالی طرزِ نگارش کو دیکھ کر کوئی بھی یہ یقین نہیں کرے گا کہ انہوں نے اس کے علاوہ اور کتابیں نہیں لکھی ہیں، بہر حال وہ نظر ثانی کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت پر آمادہ ہو گئے، اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ انہوں نے یہ خدمت بھی میرے سپرد کر دی، جو میں نے سعادت سمجھ کر قبول بھی کر لی، اب یہ خزانۂ معلومات اور قرآن مجید کے بیش قیمتی پھولوں سے سجا ہوا گلدستہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے، وہ اس کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں، اور قرآن کی دعوتِ فکر و تدبر کو آگے بڑھائیں، یہ کتاب مصنف کے ایک طاقتور مقدمہ کے ساتھ ۳۱ مضامین پر مشتمل ہے، ہر مضمون کا عنوان مختلف لیکن مرکزی خیال و موضوع ایک ہے، اس طرح یہ مختصر سی کتاب کائنات میں پھیلے ان متعدد مظاہرِ قدرت کی کیفیت و ماہیت سے روشناس کراتی ہے جن کی طرف قرآن مجید نے اشارے کیے ہیں اور جن پر غور و فکر کی دعوت دی ہے اور جن کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے، قرآن سے قربت اور مطالعہ قرآن کا ذوق عام کرنے کا ذریعہ بنائے، نفوس انسانی کی ہدایت کے لیے یہ کتاب کامیاب وسیلہ ثابت ہو، اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے علوم و معارف کا فیض جاری و ساری فرمائے اور ہم سب کو اپنی کتاب اور اس کے علوم کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔

اللھم ارنا الأشیاء کما ھی
اللھم وفقنا لما تحب و ترضی

☆☆☆

❑ تحقیق و تنقید

(قسط:...۲)

اہل کتاب کے کفر کے اسباب

مولانا محمد غزالی ندویؒ

پوری امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے آنے کے بعد یہود ونصاری میں سے جن لوگوں نے آپ کو نبی تسلیم نہیں کیا اور آپ کی اتباع قبول نہیں کی، وہ ایمان والے نہیں ہیں، اس لیے وہ امت مسلمہ کا حصہ نہیں بن سکتے۔اس کی پہلی اور اصل وجہ تو یہی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔انھوں نے اللہ کے آخری پیغمبر کو ٹھکرایا اور اس کی لائی ہوئی کتاب کی اتباع نہیں کی۔اس کے علاوہ دوسری وجہ ان کے وہ بے شمار عقائد بھی ہیں جن کو ماننے کے بعد کوئی انسان ایمان والا نہیں رہ سکتا۔اس کتاب میں چونکہ ہمارا مقصود عیسائی اور یہودی عقائد کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے، اس لیے ہم صرف ایسی چند ضروری چیزیں بیان کریں گے جن سے ان کا کفر واضح ہو جائے۔

۱۔ مسیحی قانون ایمان اور عقیدہ تثلیث

حضرت عیسی علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا، تو اس کے کچھ عرصے بعد ہی عیسائیوں کے درمیان حضرت عیسی علیہ السلام کی ذات، کنہ اور حقیقت کے سلسلے میں بہت سے نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔تیسری صدی عیسوی تک ان اختلافات کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی۔اسی دوران شاہ قسطنطین عیسائیت میں داخل ہوا۔اس نے جب یہ صورت حال دیکھی تو سنہ ۳۲۵ء میں ''نیقیہ'' میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ متفقہ طور پر اعتقادات کا ایک منشور مرتب کیا جائے، جس پر عقیدہ رکھنا پوری عیسائی دنیا کے لیے لازم ہو، اور جس سے انحراف کرنا عیسائیت سے خروج کے مترادف سمجھا جائے۔غور وخوض کے بعد اعتقادات کا جو چارٹ تیار کیا گیا اسے ''مسیحی قانون ایمان'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا اصل متن یونانی زبان میں ہے۔پھر مختلف زبانوں میں اُس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ہم یہاں اُس کا انگریزی ترجمہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ویب سائٹ سے اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

"I belive in one God, the Father almighty, maker of heaven and earth, of all things visible and invisible.

I belive in one Lord Jesus Christ, the only Begotten Son of God, born of the Father before all ages. God from God, Light from Light, true God from true God, begotten,not made, consubstantial with the Father, through him all things were made.

For us men and for our salvation he came down from heaven, and by the Holy Sprit was incarnate of the virgin mary, and became man. For our sake he was crucified under Pontius Pilate.he suffered death and was buried, and rose again on

the third day in accordance with the Scriptures.

He ascended into heaven and is seated at the right hand of the Father. He will come again in glory to judge the living and the dead and his kingdom will have no end.

I believe in the Holy Sprit, the Lord, the giver of life, who proceeds from the Father and the Son, who with the Father and the Son is adored and glorified,who has spoken through the prophets.

I believe in one, holy, catholic and apostolic church. I confess one baptism for the forgivenesss of sins and I look forward to the resurrection of the dead and the life of theworld to come. amen". (1

"میں ایمان رکھتا ہوں ایک ہی خدا قادر مطلق باپ پر، جو آسمان اور زمین اور سب دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا بنانے والا ہے۔

اور ایک ہی خداوند یسوع مسیح پر ایمان رکھتا ہوں جو خدا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ سب زمانوں سے پہلے باپ سے پیدا ہوا، وہ خدا سے خدا، نور سے نور، سچے خدا سے سچا خدا ہے۔ وہ پیدا ہوا، بنایا نہیں گیا۔ اُس کا اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔ اُس کے وسیلے سے سب کچھ بنا۔

وہ ہمارے لیے اور ہماری نجات کے لیے آسمان سے اتر آیا۔ وہ روح القدس کی قدرت سے کنواری مریم کے بطن میں پلا اور انسان بنا، وہ ہمارے لیے پیلاطس بنطی کے عہد میں مصلوب ہوا، اُس نے موت کا دکھ اُٹھایا اور دفن کیا گیا اور نوشتوں کے مطابق تیسرے دن جی اٹھا۔

وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا، اور باپ کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہے۔ وہ زندوں اور مردوں کی عدالت کرنے کو جلال کے ساتھ پھر آئے گا۔ اُس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا۔

میں ایمان رکھتا ہوں روح القدس پر بھی، جو خداوند ہے اور زندگی بخشنے والا ہے۔ وہ باپ اور بیٹے دونوں سے منبثق ہے۔ باپ اور بیٹے کے ساتھ یکساں اُس کی پرستش اور تمجید کی جاتی ہے۔ اُس نے نبیوں کی معرفت کلام کیا۔

میں ایک پاک کیتھولک رسولی کلیسا پر ایمان رکھتا ہوں، اور گناہوں کی معافی کے لیے ایک ہی بپتسمہ کا اقرار کرتا ہوں، نیز مُردوں کی قیامت، اور آنے والی زندگی کی امید رکھتا ہوں۔ آمین"۔

اس قانون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب، اللہ کا بیٹا، معبود، خدا کے مساوی اور یوم جزا میں حساب لینے والا کہا گیا ہے۔ اسی طرح روح القدس کو رب، زندہ کرنے والا اور خدا سے نکلا ہوا کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کفریہ عقائد ہیں۔ عیسائیوں کے تینوں بنیادی فرقوں: کیتھولک، آرتھوڈوکس اور پروٹسٹنٹ کا اس قانون پر ایمان ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے فرقے بھی، جو انھی تینوں میں سے کسی ایک کی شاخ ہیں، یا ان میں سے ہی کسی سے ٹوٹ کر بنے ہیں، اس قانون کو مانتے ہیں؛ البتہ عیسائیوں کا ایک فرقہ "شہود یہوہ" اور بعض چھوٹے فرقے اپنی بہت سی کفریات کے باوجود اس قانون کی کئی چیزوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ آگے ہم ان فرقوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

اس قانون ایمان کی بنا پر عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم (person) سے مرکب ہے: باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اسی عقیدے کو "عقیدۂ تثلیث" کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح عیسائیوں کے یہاں یہ ہے کہ باپ خدا ہے بیٹا خدا ہے، اور روح القدس خدا ہے؛ لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں؛ بلکہ ایک ہی خدا ہیں، بالفاظ دیگر جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا سمجھنا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو تین خدا نہ سمجھا جائے۔

چوتھی صدی عیسوی کے عیسائی عالم آگسٹائن (Augustine) نے بہت تفصیل سے اس عقیدے کو سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

" Thus the Father and the Son and the Holy sprit, and each of these by himself, is God, and at the same time they are all one God; and each of them by himself is a complete substance, and yet they are all one substance. The Father is not the Son nor the Holy Sprit; the Son is not the Father nor the Holy sprit; the Holy Sprit is not the Father nor the Son: but the father is only father, the Son is only Son, and the HolySprit is only Holy Sprit.

To all three belong the same eternity, the same unchange- ableness, the same majesty, the same power".(2)

''اس طرح باپ، بیٹے اور روح القدس میں سے ہر ایک فی نفسہ خدا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ وہ سب (مل کر) ایک ہی خدا ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں مستقل وجود ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ وہ سب ایک ہی وجود ہیں۔ باپ نہ بیٹا ہے اور نہ روح القدس ہے۔ بیٹا نہ باپ ہے اور نہ روح القدس ہے۔ روح القدس نہ باپ ہے اور نہ بیٹا ہے؛ بلکہ باپ صرف باپ ہے، بیٹا صرف بیٹا ہے اور روح القدس صرف روح القدس ہے، سب کو ایک ہی طرح کی ازلیت وابدیت، ایک ہی طرح کی عظمت اور ایک ہی طرح کی طاقت حاصل ہے، اور سب یکساں طور پر ناقابل تبدیل ہیں''۔

عیسائی عالم حلمی القمص یعقوب ان اقانیم کی مساوات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لكل من الأب والإبن جميع الكلمات الإلهية فربنا يسوع المسيح مساوٍ للأب في كل شيء لأن الإبن و الأب لهما ذات الجوهر الإلهى الواحد أو الطبيعة الإلهية الواحدة أوِ الذَّاتِ الإلهية الواحدة ولهما روح واحد هو روح الله القدوس". (۳)

''باپ اور بیٹے دونوں کو تمام خدائی کمالات حاصل ہیں، اس لیے کہ ہمارے رب یسوع مسیح ہر چیز میں باپ کے مساوی ہیں، چوں کہ باپ اور بیٹے دونوں کا ایک ہی خدائی جوہر، ایک ہی خدائی طبیعت، ایک ہی خدائی ذات اور دونوں کی ایک ہی روح ہے جو روح اللہ القدوس ہے''۔

ظاہر ہے کہ یہ کفریہ عقیدہ ہے۔ قرآن صاف کہتا ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾[المائدة:۷۳] .

''وہ لوگ (بھی) یقیناً کافر ہو چکے ہیں جنھوں نے یہ کہا ہے کہ: اللہ تین میں کا تیسرا ہے''۔

عیسائیوں کے تینوں بڑے فرقے کیتھولک (Catholic)، ارتھوڈوکس (Orthodox) اور پروٹسٹنٹ (Protestent) تثلیث کو اپنے عقیدے کا جز مانتے ہیں؛ البتہ کئی چھوٹے چھوٹے فرقے جیسے Jehovas witnesses, cristadelphians اور International church وغیرہ اپنی دوسری کفریات کے باوجود تثلیث کو نہیں مانتے۔

۲۔ حلول کا عقیدہ

جو لوگ تثلیث کو مانتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کی صفت کلام ہی درحقیقت اقنوم ابن ہے اور وہی مجسم ہو کر حضرت عیسی علیہ السلام کے روپ میں آ گئی تھی۔ انجیل یوحنا میں ہے:

۱۔ ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا

۲۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔

۳۔ سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں، اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔

پھر آیت: ۱۴ میں لکھا ہے:

۴۔ اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا۔ (۴)

اس عقیدے کے مطابق ''حضرت مسیح بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی''۔

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ہے:

" The cristian doctrine of crist is that he was truly devine and really human, and heresy has been a denial of the one or the other nature, or their union in his person..... the accepted formula is two natures in one person".(5)

''حضرت مسیح کے سلسلے میں عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ وہ حقیقتاً خدا بھی تھے اور انسان بھی، ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے''.....صحیح اور مقبول نظریہ ہے کہ (ان کی) ایک ہی شخصیت میں (انسانی اور خدائی) دونوں حیثیتیں جمع تھیں''۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک واضح کفریہ عقیدہ ہے جس کی تردید قرآن نے اس طرح کی ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [المائدة:١٧].

''بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح بن مریم ہے۔ پوچھو! کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح بن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو، اللہ ہی کے لیے ہے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

بعض چھوٹے عیسائی فرقے جیسے Jehovas witnesses, اور Cristadelphians اس عقیدے کو نہیں مانتے۔

۳۔ ابنیت مسیح

تمام ہی مسیحی فرقوں کا ماننا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، حتی کہ وہ فرقے بھی جو تثلیث کے منکر ہیں حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ضرور قرار دیتے ہیں، اور سب جانتے ہیں کہ کسی کو اللہ کا بیٹا ماننا ایک کفریہ عقیدہ ہے، جس کو ماننے کے بعد کوئی مومن نہیں رہ سکتا:

﴿وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ [التوبة:٣٠]

''اور نصاری مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے۔ اللہ ان کو غارت کرے! کہاں ان کی عقل الٹی ہوئی جا رہی ہے''۔

دوسری جگہ قرآن نے اس عقیدے کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا﴾ [مريم:٨٨–٩١].

''اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایسی سنگین بات کہی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں کہ انھوں نے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کی۔ اور یہ بات خدا کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ اولاد بنائے''۔

عیسائی کس معنی میں حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، یہ جاننا بہت ضروری ہے؛ اس لیے کہ بعض لوگ اس سلسلے میں لیپاپوتی کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اور اس طرح کے الفاظ ''کتاب مقدس'' میں عام انسانوں کے لیے بھی

استعمال ہوئے ہیں، جس طرح ان تمام جگہوں پر ''ابناء اللہ'' سے اللہ کے مطیع، اس پر ایمان رکھنے والے یا اللہ کے محبوب مراد ہیں، اسی طرح عیسائی حضرت مسیح کو بھی انھی معنوں میں ابن اللہ کہتے ہیں۔ اس طرح کی تمام غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ہم ابنیت مسیح کا حقیقی مفہوم ایک معتبر عیسائی مذہبی رہنما کی تحریر سے پیش کرتے ہیں۔ اپنے دور میں مصری چرچ کے اپنے دور کے سب سے بڑے مذہبی رہنما البابا شنودہ الثالث لکھتے ہیں:

"بنوة المسيح من الله تدل على لاهوته، وليست كبنوة البشر "الذين قابلوه أعطاهم سلطاناً أن يصيروا أولاد الله أي المؤمنين باسمه [يو١:١٢] ولا هي بنوة بالمحبة، "أنظروآية محبة أعطانا الأب أن ندعى أولاد الله". [يو٣:١].

''حضرت مسیح کی ابنیت ان کی خدائی کی دلیل ہے اور یہ ابنیت ایسی نہیں جیسی کہ بعض انسانوں کو حاصل ہے، جیسا کہ یوحنا، باب:۱، آیت:۱۲ میں ہے: ''جنھوں نے اسے قبول کیا اس نے انھیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں''۔ اور نہ ہی (یسوع کی) ابنیت محبوبیت کے معنی میں ہے، جیسا کہ یوحنا (کے رسالے ۱، باب:۳، آیت:۱) میں ہے:

ولا هي بنوة بالتبني ولكنها بنوة ذاتية من جوهر الله و من طبيعته ، كبنوة الشعاع من الشمس، وبنوة الحرارة من النار، وبنوة الفكر من العقل، بهذه البنوة التي لها نفس الطبيعة دعي المسيح ابن الله الوحيد، وبهذه البنوة قال المسيح "أنا والأب واحد" (يو١٠ : ٣٠) "من رآني فقد رأى الأب" (يو١٤ : ٩) "أنا في الأب والأب فيّ". (يو١٤ : ١١).

عیسائی عالم القمص یوسف اُسعد کہتے ہیں:

''دیکھو تو باپ نے ہمیں کیسی محبت سے نوازا ہے کہ ہمیں ''اولاد اللہ'' (اللہ کی اولاد) کہا جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا مطلب اللہ کا حضرت مسیح کو غیر حقیقی طور پر اپنا بیٹا بنانا ہے؛ (اس طرح کی معنوی ابنیتوں کے بجائے) حضرت مسیح کی ابنیت ''(ان کی) ذات سے'' متعلق ہے، جس میں اللہ تعالی کے جوہر اور اس کی طبیعت کے خواص ہیں، ان کا اور اللہ تعالی کا تعلق ایسا ہے جیسا شعاع کا سورج سے، حرارت کا آگ سے اور فکر کا عقل سے ہوتا ہے، اس طرح کی ابنیت کی وجہ سے جس میں اصل کے خواص ہیں، حضرت مسیح کو اللہ کا اکلوتا بیٹا کہا گیا، اور اسی ابنیت کی وجہ سے حضرت مسیح نے فرمایا تھا: ''میں اور باپ ایک ہی ہیں''۔ ''جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا''۔ ''میں باپ کے اندر ہوں اور باپ میرے اندر ہے''۔

" والبشر يُدعون أبناء الله من أجل محبة الله بهم وعنايته بهم، هذه المحبة تجتاز الهوة السحيقة بين الله والناس، ولكنها لا تلغيها؛ ولكن ربنا يسوع المسيح هو ابن الله من صميم الأب نفسه، الهوة تفصل

''انسانوں کو اللہ کے بیٹے کہا جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے، اور ان کا خیال رکھتا ہے۔ یہی محبت اس فاصلے کو کم کرتی ہے جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہے؛ لیکن بہرحال اس فاصلے کو بالکل ختم نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ہمارے رب یسوع مسیح اللہ کے ایسے بیٹے ہیں، جو خود باپ سے نکلے ہیں۔

تفصل بين الخالق و المخلوق؛ لكن ابن الله والأب نفسه يشتركان كلاهما في الطبيعة الإلهية الواحدة". (٦)

خالق اور مخلوق کے درمیان تو گہرا فاصلہ ہوتا ہے جو مخلوق کو خالق سے الگ کرتا ہے؛ لیکن اللہ کا بیٹا اور خود باپ ایک ہی خدا کی طبیعت میں شریک ہیں''۔

بعض لوگ اس سلسلے میں یہ بھی مغالطہ دیتے ہیں کہ عیسائی جب حضرت عیسی علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جس طرح انسانوں میں شادی، ازدواجی تعلقات اور ولادت کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی چیز (معاذ اللہ) اللہ کے ساتھ بھی

ہوئی؛ بلکہ وہ تو صرف اتنا مانتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام اللہ کی ذات سے نکلے ہیں، اس لیے ان کی طبیعت اور جوہر وہی ہے جو اللہ کا ہے اور انھیں اللہ سے وہ خصوصی تعلق ہے جو ایک بیٹے کو باپ سے ہوتا ہے۔

اس مغالطے کا جواب یہ ہے کہ اول تو عیسائی کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور کیا سوچ کر حضرت عیسی علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے رہے ہیں یہ بات اللہ کو خوب معلوم تھی، پھر بھی اس نے ان کے اس عقیدے کو کفر کہا ہے، اس لیے اس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ثانیاً کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اللہ کی ذات سے نکلا ہے اور اس کی طبیعت اور جوہر وہی ہے جو اللہ کی طبیعت اور جوہر ہے، اسے خدا کے مساوی قرار دینا ہے، جو شرک ہے۔

ابنیت مسیح کے سلسلے میں کیتھولک، آرتھوڈوکس اور پروٹسٹنٹ کے عقائد کے مقابلے میں Jehovas witnesses, اور Cristadelphians کا عقیدہ نسبۃً ہلکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اللہ نے انھیں سب سے پہلے اور بغیر کسی واسطے کے پیدا کیا، جب کہ دوسری تمام چیزوں کی تخلیق حضرت عیسی کے ذریعے کی گئی۔ اس طرح انھوں نے گرچہ حضرت عیسی کو خدا کا بیٹا نہیں مانا؛ لیکن عقیدے کی ایک دوسری خرابی کا شکار ہو گئے؛ اس لیے کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ ہر چیز کی تخلیق حضرت عیسی کے ذریعے ہوئی ہے۔

۴۔ حضرت عیسی بھی خالق ہیں

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز حضرت عیسی کے ذریعے وجود میں آئی ہے، اس لیے وہ بھی خالق ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یوحنا کے باب: آیت: ۳، اور کلسّیوں کی مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

''کیونکہ اسی میں سب چیزیں پیدا کی گئیں، آسمان کی ہوں یا زمین کی۔ دیکھی ہوں یا اندیکھی۔ تخت ہوں یا ریاستیں یا حکومتیں یا اختیارات۔ سب چیزیں اسی کے وسیلے سے اور اسی کے واسطے پیدا ہوئی ہیں''۔ (۷)

حلمی القمص یعقوب اپنی کتاب أسئلة حول ألوهية المسيح: ۹۷ میں لکھتے ہیں:

"ليست بنوة السيد المسيح لله الأب بنوة بالخلقة: كما قيل عن "آدم ابن الله". (لو ۳:۳۸) لأنه هو الخالق ذاته "كل شيء به كان و بغيره لم يكن شيء مما كان". (يو ۱:۳)

''حضرت مسیح کو باپ خدا کا بیٹا جو کہا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدا نے ان کی تخلیق کی جیسا کہ لوقا باب: ۳، باب: ۳ آیت ۳۸ میں حضرت آدم کو (اسی وجہ سے) اللہ کا بیٹا کہا گیا ہے؛ اس لیے کہ حضرت مسیح تو خود خالق ہیں۔ یوحنا باب: ۱، آیت: ۳ میں ہے: ''سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں، اور جو کچھ پیدا ہوا ہے، اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی''۔

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

"ولأن السيد المسيح هو الإله الخالق المتأنس لذلك نجده يقوم بأعمال الخلقة". (۸)

''اور چوں کہ حضرت مسیح انسانی روپ میں خدا تھے، جو خالق ہے، اسی لیے ہم انھیں تخلیق کے مختلف کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں''۔

پھر حضرت مسیح کے ایک معجزے مٹی سے دو آنکھیں بنانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"إنها معجزة خلقة بكل المقاييس أراد بها السيد المسيح تقديم وسيلة إيضاح على أنه الله الخالق المتأنس، ولذلك خلق عينين لم يكن لهما وجود من قبل". (۹)

''یہ آخری درجے کا تخلیقی معجزہ ہے، جس سے حضرت مسیح نے یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ وہ انسانی شکل میں اللہ ہی ہیں، جو خالق ہے، اسی وجہ سے وہ دو آنکھیں تخلیق کر سکے جن کا پہلے سے کوئی وجود نہ تھا''۔

عیسائی، حضرت عیسی کو خالق ثابت کرنے کے لیے کئی طرح کی دلیلیں دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر چیز خدا نے پیدا کی، اور خدا تین اقانیم سے مرکب ہے، جن میں سے دوسرا اقنوم حضرت عیسی ہیں، اس طرح حضرت عیسی بھی خالق ہوئے۔ اسی بات کو بعض دوسرے عیسائی اس طرح کہتے ہیں کہ اللہ نے ہر چیز کی تخلیق اپنی عقل وحکمت اور کلام سے کی، اور حضرت عیسی خدائی کا اقنوم ثانی یعنی خدا کی صفت کلام وعقل وحکمت ہیں، اس طرح خدا نے جو کچھ پیدا کیا ان ہی کے ذریعے کیا تو وہ بھی خالق ہوئے۔ عیسائیوں کے بعض فرقے Jehova's witnesess وغیرہ اُنھیں خالق تو نہیں کہتے؛ البتہ کلسیّوں کے مذکورہ بالا اقتباس اور انجیل یوحنا کی بعض عبارتوں کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ساری چیزوں کی پیدائش حضرت عیسی کے توسط سے ہوئی۔

بہرحال، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خالق ماننا اسلامی اعتبار سے واضح طور پر شرک ہے۔ اسلام کے مطابق آسمان وزمین اور ہر چیز کو بنانے والا، اسے ڈیزائن کرنے والا اور اسے عدم سے وجود میں لانے والا صرف اللہ ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لاَ يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ﴾ [النحل ٢٠].

''اور اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جن (دیوتاؤں) کو پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود ہی مخلوق ہیں''۔

دوسری جگہ ہے: ﴿قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُوْنَ﴾ [يونس ٣٤].

''کہو کہ: ''جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہو، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرے، پھر (ان کی موت کے بعد) انھیں دوبارہ پھر پیدا کرے؟''۔ کہو کہ: ''اللہ ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر ان (کی موت کے بعد) انھیں دوبارہ پھر زندہ کردے گا۔ پھر آخر کوئی تمھیں کہاں اوندھے منہ لیے جارہا ہے؟''۔

ایک اور جگہ کہا گیا ہے: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ﴾ [سبا:٢٢]

''آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا (کارساز) سمجھ رہے ہو ان کو پکارو۔ وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے۔ اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے''۔

۵۔ قیامت کے دن حساب وکتاب کا اختیار

عیسائیوں کا ماننا ہے کہ روز جزا حضرت عیسی علیہ السلام ہی لوگوں کا حساب وکتاب لے کر ان کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ کریں گے۔

انجیل متی میں ہے:

''کیوں کہ ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئے گا۔ اُس وقت ہر ایک کو اُس کے کاموں کے مطابق بدلہ دے گا''۔(۱۰)

انجیل متی ہی میں دوسری جگہ ہے:

''ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اُس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے، اور اُن کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے، وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا''۔(۱۱)

کتاب مقدس میں کرنتھیوں کے نام سینٹ پال کے دوسرے خط میں ہے: ''کیونکہ ضرور ہے کہ مسیح کے تخت عدالت کے سامنے جا کر ہم سب کا حال ظاہر کیا جائے؛ تاکہ ہر شخص اپنے اُن کاموں کا بدلہ پائے جو اُس نے بدن کے وسیلے سے کیے ہوں۔ خواہ بھلے ہوں، خواہ برے''۔(۱۲)

عیسائیوں کے جدید فرقے Jehovah's Witnesses وغیرہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم تفصیل سے آٹھویں فصل میں اُن کی عبارتیں پیش کریں گے۔

عیسائیوں کے عقیدے کے برعکس اسلامی عقیدے کے اعتبار سے روز جزا کا حساب وکتاب اللہ کے لیے خاص ہے، اور اس طرح کی بات حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق کہنا ان کو خدائی اختیارات میں شریک کرنا ہے جو کفر ہے۔قرآن نے اس عقیدے پر سورۂ فاتحہ میں یہ کہہ کر کاری ضرب لگائی ہے:﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحة:٤]

''وہ روزِ جزا کا مالک ہے''۔

اور دوسری جگہ مزید وضاحت سے کہا ہے:

﴿يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [غافر: ١٦]

''جس دن وہ خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوں گے، ان کی کوئی چیز بھی خدا سے مخفی نہیں ہوگی۔آج کی بادشاہی کس کے اختیار میں ہے؟ خدائے واحد وقہار کے اختیار میں''۔

مذکورہ بالا آیات سے پتہ چلا کہ اس دن بادشاہت صرف اسی زبردست اللہ کی ہوگی، اور ذیل کی آیات بتاتی ہیں کہ صرف بادشاہت ہی نہیں، فیصلہ بھی وہی کرے گا:

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ [غافر: ١٧]

''آج ہر جان کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔بے شک اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے''۔

ایک اور جگہ کہا:

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ [الانفطار:١٩]. ''یہ وہ دن ہوگا جس میں کسی دوسرے کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا، اور تمام تر حکم اس دن اللہ ہی کا چلے گا''۔

ایک اور جگہ کہا:﴿وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٤٧]. ''اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں''۔

ایک اور جگہ کہا:

﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النبأ٣٦– ٣٨]

''یہ تیری رب کی طرف سے صلہ ہوگا بالکل ان کے عمل کے حساب سے، آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کی ساری چیزوں کے رب رحمان کی طرف سے۔کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے سامنے بول سکے۔جس دن جبریل اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، اس دن سے سوائے اس کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہو اور وہ بات بھی ٹھیک کہے''۔

قرآن کی اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ روز جزا کے فیصلے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔حضرت عیسی کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ درحقیقت ایک بت پرستانہ عقیدہ ہے، جو خود بت پرستوں کے عقیدے سے بھی زیادہ برا ہے۔

بلکہ بت پرست تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہ معبود اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں:

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [يونس: ١٨].

''اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔کہہ دو: کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو خود پتہ نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔وہ پاک اور ارفع ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں''۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو اللہ کے یہاں محض سفارشی مانتے تھے۔وہ انھیں خدا کی بارگاہ میں اس درجہ مختار نہیں مانتے تھے کہ وہ کوئی فیصلہ کر سکیں؛ مگر اس سے آگے بڑھ کر عیسائیوں کا دعوی یہ ہے کہ

حضرت عیسی علیہ السلام بندوں کا فیصلہ کر کے انھیں جنت یا جہنم کا حق دار قرار دیں گے۔افسوس کی بات ہے کہ عیسائیوں کے تمام فرقے اس مشرکانہ عقیدے پر متفق ہیں۔

۶۔ عقیدۂ مصلوبیت

یہ عقیدہ بھی موجودہ تمام مسیحی فرقوں کے یہاں مسلّم ہے۔ قرآن نے اس عقیدے کی سختی سے تردید کی ہے: ﴿وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ [النساء :۱۵۷] .

''اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا؛ حالانکہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی؛ بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا''۔

اگر چہ کسی کی مصلوبیت کو ماننا فی نفسہ کوئی کفریہ بات نہیں ہے؛ لیکن اللہ کی طرف سے قرآن میں وضاحت کے بعد کسی عیسائی کے لیے دو ہی اختیار رہ جاتے ہیں۔ یا تو اللہ، محمد ﷺ اور قرآن کو سچا مان کر عقیدۂ مصلوبیت مسیح کا انکار کرے ، یا وہ اپنے عقیدۂ مصلوبیت کو درست سمجھے اور قرآن کو ایک جھوٹی کتاب اور محمد ﷺ کو جھوٹا نبی مانے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب کو ایک جھوٹی کتاب اور خدا کے رسول کو جھوٹا نبی ماننے کی صورت میں کوئی شخص خدا کے نزدیک کیوں کر ایمان والا ہوسکتا ہے۔یہیں سے ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی مذہبی شناخت پر مصر ہے، تو اسے ایمان والا سمجھنا چاہیے۔

۷۔ احبار ورہبان کو رب بنانا

قرآن کریم میں یہود ونصاریٰ دونوں کی یہ برائی بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے احبار ورہبان کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنالیا ہے: ﴿اتَّخَذُوْٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوْٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا إِلٰهاً وَاحِداً لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة: ۳۱.

''انھوں نے اللہ کی بجائے اپنے علما اور راہبوں کو رب بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ ان کی مشرکانہ باتوں سے بالکل پاک ہے''۔

جب یہ آیت حضور اکرم ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم کے سامنے پڑھی تو حضرت عدیؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ اپنے احبار ورہبان کی عبادت تو نہیں کرتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"أَلَيْسَ يُحَرِّمُوْنَ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فَتُحَرِّمُوْنَهٗ وَ يُحِلُّوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيَسْتَحِلُّوْنَهٗ"

''کیا ایسا نہیں ہوتا کہ احبار ورہبان جس چیز کو حلال قرار دیتے ہیں، اسے تم حلال سمجھتے ہو۔اور جس کو وہ حرام قرار دیتے ہیں، اس کو حرام سمجھتے ہو؟''

حضرت عدیؓ کہتے ہیں: میں نے کہا: ہاں ایسا تو ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہی ان احبار ورہبان کی عبادت کرنا ہے۔(۱۳)

مذکورہ آیت کے ختم پر کہا گیا ہے: ﴿سُبْحَانَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ ''اللہ کی ذات ان کے شرک سے پاک ہے۔''

یہ جملہ بتاتا ہے کہ احبار ورہبان کو شریعت سازی کا اختیار دینا شرک ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اس شرک میں یہود ونصاریٰ دونوں شریک ہیں۔نصاریٰ کے اعتقادات، عبودیت کے طریقے، معاشرتی وسماجی قوانین سب کلیسا کی قانون ساز کونسل کے بنائے ہوئے ہیں، حتی کہ قانون ایمان جس سے انحراف عیسائیت سے انحراف کے ہم معنی ہے وہ بھی ''نیقیہ کونسل'' کا بنایا ہوا ہے۔ رہے یہودی تو انھوں نے جس طرح اپنے احبار کو شریعت سازی کا اختیار دیا ہے اس کی نظیر مذاہب کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ یہودیوں کے یہاں احبار کو کس درجہ شریعت سازی کا حق حاصل ہے، اس کو جاننے کے لیے تلمود کا مطالعہ ضروری ہے۔ دل کے بہلانے کو تو انھوں نے یہ خیال عام کر رکھا ہے کہ تلمود میں

موجود احکام توریت کے ساتھ زبانی طور پر دیے گئے تھے ؛لیکن بے سند ہونے کے ساتھ ان احکام پر ایک سرسری نظر یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں بس، یہودی احبار کی تشریعات ہیں۔ حیرت ہے کہ پھر بھی اس کو بیشتر یہودیوں کے یہاں تقریباً وہی مقام حاصل ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت کو حاصل ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ مسلمانوں کے ائمۂ عظام نے جو فتوے دیے ہیں، مذکورہ آیت اور حدیث کی رو سے تو وہ بھی شریعت سازی کے زمرے میں آتے ہیں اور ان مسائل کو مان لینا بھی علما کو خدا کے تشریعی اختیارات دینے کی طرح ہے، جو شرک ہے؛ اس لیے جس طرح آپ اہل کتاب پر کفر وشرک کا الزام لگا رہے ہیں، اسی طرح مسلمانوں پر بھی لگائیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے، جس کا ازالہ خود حضرت عدی بن حاتمؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے اس ٹکڑے سے ہو جاتا ہے:

"أَلَيْسَ يُحَرِّمُوْنَ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فَتُحَرِّمُوْنَهٗ وَ يُحِلُّوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيَسْتَحِلُّوْنَهٗ".

کیا ایسا نہیں ہوتا کہ احبار ورہبان جس چیز کو حلال قرار دیتے ہیں اسے تم حلال سمجھتے ہو، اور جس کو وہ حرام قرار دیتے ہیں اس کو حرام سمجھتے ہو؟

اس سے پتہ لگتا ہے کہ احبار ورہبان اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال اور حلال کردہ چیز کو حرام کر دیا کرتے تھے اور لوگ ان کی باتوں کو مان لیا کرتے تھے، اس لیے اسے احبار ورہبان کی پرستش قرار دیا گیا۔ یہی بات احبار ورہبان اور علمائے اسلام کے درمیان فرق واضح کر دیتی ہے۔ علمائے اسلام: ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد، اوزاعی، ثوری، ابن عیینہ، اسحاق بن راہویہ، عبد اللہ بن المبارک، سعید بن المسیب، نافع، ابن القیم، ابن الجوزي، نووی، لیث بن سعد، حافظ ابن حجر اور ابن تیمیہ وغیرہم نے جو قرآن وحدیث سے استنباط کر کے دیا ہے، ان میں سے کسی کے تعلق سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کردہ چیزوں کو حرام کیا کرتے تھے۔ ان حضرات کی تو انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو بات کہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اور اس کے مطابق ہی کہیں۔ اس کے برعکس احبار ورہبان خود سے مسائل گھڑ کر ان کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے تھے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ [البقرة:۷۸].

"پس ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے؛ تاکہ اس سے کچھ معمولی دام حاصل کر لیں، پس ان کے لیے تباہی ہے، اس سے بھی جو انھوں نے اپنے ہاتھوں لکھ لیا اور ان کے لیے خرابی ہے اس سے بھی جو وہ کماتے ہیں۔"

احبار ورہبان اور مجتہدین اسلام کے فتاوی میں دو بڑے فرق ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ احبار ورہبان خود سے مسائل گھڑ کر ان کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے، ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ الخ﴾، خود عدی بن حاتم کی مذکورہ بالا حدیث میں ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیا کرتے تھے: "أَلَيْسَ يُحَرِّمُوْنَ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فَتُحَرِّمُوْنَهٗ وَ يُحِلُّوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيَسْتَحِلُّوْنَهٗ".

اس سے احبار ورہبان اور علمائے اسلام کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔

نیز احبار ورہبان کے یہاں چیزوں کو حرام وحلال بتانے کا معیار ان کی خواہشات نفسانی ہوا کرتی تھیں، جب کہ علمائے اسلام کے یہاں قرآن وحدیث کی بنیاد پر کسی چیز کو حلال یا حرام کہا جاتا ہے۔ خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہوئے کسی

چیز کو حلال وحرام کہنا تو دور کی بات ہے، علمائے اسلام نے حق بات کہنے اور قرآن وحدیث کے احکام بتانے میں شاہان وقت تک کی پرواہ نہ کی۔ وہ تو ہر قیمت پر اسی بات کو صحیح کہتے تھے جس کو اللہ نے اپنی عظیم الشان کتاب میں اور محمد ﷺ نے اپنی حدیث میں صحیح کہا ہو۔ اور ہر قیمت پر اس چیز کو حرام کہتے تھے جس کو اللہ نے اپنی محکم کتاب میں یا محمد ﷺ نے اپنی سنت میں حرام کہا ہو۔ اس کے لیے انھیں قربانیاں بھی دینی پڑیں، اور سخت سے سخت تکلیفیں بھی انھوں نے برداشت کیں۔ امام مالکؒ طلاق مکرہ کے قائل نہ تھے۔ والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے (جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا) امام صاحب کو حکم دیا کہ وہ یہ فتوی نہ دیں؛ لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لیے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔ امام احمد بن حنبلؒ کا خلق قرآن کا واقعہ زبان زد خاص وعام ہے، جس میں حکومت وقت کے آگے نہ جھکنے اور حق میں کسی مداہنت کو گوارا نہ کرنے کی پاداش میں آپ کو سخت ترین سزا دی گئی۔ اسلامی تاریخ علمائے کرام کے اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات نے حق بات کے اظہار میں کسی کی پرواہ نہ کی، خواہ انھیں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، پھر اُن پر احبار ورہبان کی مثال کیوں کر فٹ کی جاسکتی ہے؟۔

دوسرا بہت بڑا فرق احبار ورہبان کی تشریعات اور علمائے اسلام کے استنباطات میں یہ ہے کہ علمائے اسلام کے استنباطات پر کوئی بھی شخص قرآن وحدیث کی روشنی میں نکیر کرسکتا ہے، اس کے برعکس احبار ورہبان کی تشریعات اہل کتاب کے یہاں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھیں خدائی حکم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جن پر نہ اعتراض کی گنجائش ہوتی ہے، نہ کسی قسم کے حذف واضافے یا تبدیلی کی۔ خود مسیحی قانونِ ایمان احبار ورہبان کی تشریعات کا نتیجہ ہے اور اس سے خروج گویا مسیحیت سے خروج کے ہم معنیٰ ہے۔ بعض عیسائی فرقے جو مسیحی قانون ایمان کے بعض اجزا کو نہیں مانتے (جیسے ''شہود یہوہ'') انھیں عیسائی اپنا فرقہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

یہی حال یہودیوں کا ہے۔ یہودی احبار ورہبان کی تشریعات پر مشتمل تلمود کو یہودیوں کے نزدیک وہی مقام حاصل ہے، جو خود تورات کو حاصل ہے؛ بلکہ بعض اعتبارات سے اس کی حیثیت تورات سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہود ونصاریٰ کے اس مشرکانہ رویے کے برعکس ائمہ کے متبعین نے قرآن وحدیث اور علما کے استنباطات میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا ہے۔ علمائے اسلام کے کسی استنباط کو مسلمانوں کے یہاں اعتبار ہی تب حاصل ہوتا ہے، جب اس کی سند قرآن وحدیث میں موجود ہو۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان استنباطات کا محاکمہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ اسلام کی نامور ہستیوں: امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری اور ابن تیمیہ رحمہم اللہ سب ہمیشہ یہی تلقین کرتے رہے کہ میری ان ہی باتوں کو تسلیم کیا جائے جو قرآن وحدیث کے مطابق ہوں، اور جو بات قرآن وحدیث کے مخالف معلوم ہو، اسے رد کردیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مقولہ ہے: " لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي أن يفتي بكلامي" (١٤)

''جسے میری دلیل معلوم نہ ہو، اُسے میری رائے پر فتوی نہیں دینا چاہیے''۔

امام شافعیؒ کا قول ہے:

" إذا صح الحديث فهو مذهبي". وفي رواية: " وإذا رأيتم كلامي يخالف الحديث فاعملوا بالحديث واضربوا بكلامي الحائط". (١٥)

''صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''جب میرا قول حدیث کے خلاف پاؤ، تو حدیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو''۔

اسی طرح کے اقوال دیگر ائمہ سے بھی منقول ہیں۔ ان حضرات کی فقہ سے استفادہ کرنے والوں نے بھی ہمیشہ یہی سمجھا کہ ہم اصلاً صرف اللہ اور اس کے رسول کے متبع

ہیں۔ائمۂ اربعہ یا ان کے علاوہ دوسرے کسی بھی عالم کی حیثیت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مبلغ اور شارح کی تو ہے؛لیکن شارع کی نہیں،اس لیے جہاں کہیں یہ محسوس ہو کہ ان حضرات سے کوئی علمی سہو ہوا ہے،تو ان کی بات کو رد کر دینا چاہیے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

'' جس مسئلے میں کسی عالم وسیع النظر ذکی الفہم منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو ایسے عالم سے، بہ شرطیکہ متقی ہو، بہ شہادت قلب معلوم ہو جائے کہ اس مسئلے میں راجح دوسری جانب ہے،تو دیکھنا چاہیے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقعے پر جہاں احتمال فتنہ وتشویش عوام کا ہو، مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لیے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے...اور اگر اس جانب مرجوح میں گنجائش عمل نہ ہو؛ بلکہ ترک واجب یا ارتکاب امر ناجائز لازم آتا ہو اور بہ جز قیاس کے اس پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی ہو اور جانب راجح میں صحیح صریح دلیل موجود ہے،اس وقت بلا تردد حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا اور اس مسئلے میں کسی طرح تقلید جائز نہ ہوگی؛ کیوں کہ اصل دین قرآن وحدیث ہے ،اور تقلید سے یہی مقصود ہے کہ قرآن وحدیث پر سہولت وسلامتی سے عمل ہو۔جب دونوں (یعنی تقلید امام اور قرآن وحدیث) میں موافقت نہ رہی،تو قرآن وحدیث پر عمل ہوگا۔ایسی حالت میں بھی اسی (تقلید) پر جمارہنا، یہی وہ تقلید ہے، جس کی مذمت قرآن وحدیث واقوال علما میں آئی ہے''۔(۱۶)

یہ باتیں صرف نظریاتی طور پر تسلیم کر لینے تک محدود نہیں رہیں؛ بلکہ فقہ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ بے شمار مسائل میں ائمۂ کرام کی باتوں کو خود ان سے اپنا علمی رشتہ جوڑنے والوں نے رد کیا ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے دو تہائی مسائل میں اپنے عالی مقام استاد کی رائے کو رد کر کے ان سے اختلاف کیا ہے۔یہی حال دیگر ائمہ کے متبعین کا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہے کہ احبار ورہبان کے برخلاف علمائے اسلام نے کبھی بھی اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کیا،اور نہ ہی امت نے کبھی انھیں یہ اختیار دیا۔اس لیے احبار ورہبان کی خود ساختہ تشریعات پر علمائے اسلام کے استنباطات کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی

(۱) www.britanica.com/topic/Nicene-Creed

(۲) On in Four Books, book:1, chapter: 5. Christian Doctrine

(۳) أسئلة حول ألوهية المسيح: ٤٠.

(۴) یوحنا،۱:۱،۲،۳،۱۴۔

(۵) Encyclopedia of Religion and Ethics 3:B 597

(۶) محاضرات مبسطة عن لاهوت السيد المسيح : ١٥-١٦.(۷) کلسیوں:۱:۱۶۔(۸)أسئلة حول ألوهية المسيح : ٤١ (۹)سئلة حول ألوهية المسيح(۲۱۰)٤ متی۱۶:۲۷۔

(۱۱)متی۱۳:۴۱-۴۲۔(۱۲) کرنتھیوں دوم:۵:۱۰۔(۱۳) سنن البيهقي الكبرى، رقم:٢٠١٣٧/السلسلة الصحيحة: رقم: ٣٢٩٣/ وقد حكم ابن تيمية على الحديث بأنه حديث حسن/ وحسّنه الألباني في السلسلة الصحيحة/ سنن الترمذي، كتاب التفسير، باب: ومن سورة التوبة،رقم: ٣١٠٦.

(۱۴) عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد:٧٥. (۱۵) ایضاً:۷۶۔(۱۶)الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد:۸۴-۸۶(مقصد ہفتم)۔

(.....جاری)

☆☆☆

تحقیق وتنقید

امام شافعی: مستشرقین وناقدینِ مستشرقین کی نظر میں

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل (پاکستان)

میسر ذرائع کے مطابق امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ (م 204ھ/ 820ء) کی کتاب "الرسالۃ" علم اصول فقہ کی پہلی کتاب مانی جاتی ہے۔ آپ نے "احکام شریعہ اخذ کرنے کے طریقے" کو الگ سے موضوع بنا کر اسے مدون کرنے کا اہتمام فرمایا جب کہ آپ سے قبل اس موضوع پر باضابطہ تحریر میسر نہیں تھی، اگرچہ متعدد ائمہ مجتہدین فقہی احکام پر اپنا تفصیلی کام پیش کر چکے تھے۔ اسی لیے امام رازی (م 606ھ/ 1210ء) "مناقب الامام الشافعی" میں امام شافعی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اصول فقہ میں آپ کو وہی مقام حاصل ہے جو ارسطو کا علم منطق اور علامہ خلیل کا علم عروض وشعر گوئی میں ہے کہ موخر الذکر سے پہلے لوگ بلاشبہ منطق کے قوانین برتتے تھے اور اشعار بھی کہتے تھے؛ لیکن یہ ایک ذوقی نوعیت کی چیز تھی اور کوئی ایسا پیمانہ مقرر نہ تھا جس پر پرکھ کر منطقی استدلال وشعر کی موزونیت کو جانچا جاسکے اور دوسرے پر حجت قائم کی جاسکے۔ اسی طرح امام شافعی سے قبل لوگوں کے پاس کوئی ایسا منضبط قانون کلی نہ تھا جس کے ذریعے ایک دوسرے کے استدلال کو جانچا جاسکے کہ جس نے جو کہا وہ کیوں کر اور کیسے درست ہے۔

امام شافعی کے حوالے سے ایسی آراء اسلامی تاریخ میں موجود رہی ہیں، تاہم مستشرقین (orientalists) نے اپنے روایتی منہج بحث کو اختیار کرتے ہوئے جہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ سنت وحدیث کا ذخیرہ اسلامی قانون کی ابتدائی تشکیل کے بعد (بالخصوص تیسری صدی ہجری) کی پیداوار ہے، ساتھ ہی بعض نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ امام شافعی سے قبل گویا ماخذِ شرع کا کوئی واضح تصور مسلمانوں کے ہاں موجود نہ تھا اور مسلمان بے ڈھب طرز پر قانون تشکیل دیتے رہے، یہاں تک کہ امام شافعی نے تقریباً دوصدیوں بعد اخذ قانون کا قاعدہ مقرر کیا۔ ان آراء کے اظہار کا سلسلہ مشہور مستشرق گولڈزیہر سے ہوتا ہوا جوزف شاخت اور مابعد تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی تناظر میں مشہور مستشرق جوزف شاخت (Schacht,) نے کتاب The Origins of Muhammadan Jurisprudence میں امام شافعی کو اصول فقہ کا "ماسٹر آرکیٹیکٹ" قرار دیا۔ ان کی یہ بات "كلمة حق أريد بها الباطل" کا مصداق تھی؛ کیونکہ ان حضرات کی فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں فقہ کی ڈویلپمنٹ کا اصول فقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ نظری علم مسلمانوں نے بعد میں وضع کیا۔ گویا آپ سے قبل امام ابوحنیفہ

(م 150ھ/ 767ء) و مالک (م 179ھ/ 795ء) و دیگر مجتہدین نے فقہ کا جو ذخیرہ چھوڑا، وہ الل ٹپ اور مقامی روایات وغیرہ کے تناظر میں متشکل ہوتا رہا۔

اسلامی قانون کی تشکیل کے بارے میں مستشرقین کے یہ دعوے گمراہ کن تھے اور اسی لیے عالم اسلام کے اہل علم نے ان کا بھرپور تعاقب کیا۔ اس کاوش کے نتیجے میں ابتدائی صدیوں میں سنت وحدیث کی تدوین اور تشریعی حیثیت پر وقیع کام سامنے آیا جس کی ایک طویل لسٹ تیار کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل علم نے یہ دکھانے کی کوشش بھی کی کہ امام شافعی سے قبل اصول فقہ کے مباحث کا واضح ادراک موجود تھا۔ اسلامی یونیورسٹی (پاکستان) کے ایک اہل علم جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب (م 2016ء) نے ابتدائی دو صدیوں کے دوران کوفہ کے علاقے میں اسلامی قانون کی تشکیل پر پی ایچ ڈی کے وقیع مقالے (Early development of Islamic Fiqh in Kufa with Special Reference to the Works of Abu Yousuf and Shaybani) میں ائمہ احناف کی کتب سے مستشرقین کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ ابتدائی صدیوں میں سنت وحدیث کو ماخذ قانون کے طور پر نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آپ نے ان کتب کے تفصیلی حوالہ جات کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ائمہ احناف کے نزدیک حدیث وسنت "خبر لازم" کی حیثیت رکھتی تھی اور اہل کوفہ کے بارے میں "اہل الرائے" کے عمومی پروپیگنڈے کے برعکس حنفی ائمہ کثرت کے ساتھ سنت وحدیث سے استدلال کیا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصر، شام، مدینہ و کوفہ کی فقہی روایات میں سے بالخصوص کوفہ کی فقہی روایت زیادہ مربوط و منظم تھی اور مختلف فقہی روایات کا یہی کام امام شافعی کی "الرسالۃ" کے لیے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

محترم انصاری صاحب کا یہ مقالہ بہت حد تک متوازن محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہ نہیں مانا جاسکتا کہ ایک شخص یوں اچانک اٹھ کر یکدم "الرسالۃ" جیسی اتنی منظم کتاب لکھ دے، یقیناً اس کی پشت پر ایک طویل علمی روایت موجود ہوتی ہے جسے مد نظر رکھتے ہوئے ہی چند مخصوص سوالات کو مقرر کر کے ان کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مستشرقین کو جواب دیتے ہوئے تاریخی تناظر میں اس نوعیت کا کچھ کام جناب ڈاکٹر فضل الرحمان انصاری صاحب (م 1988ء) نے اپنی کتاب Islamic Methodology in History میں بھی پیش کیا، تاہم حدیث وسنت کے بارے میں ان کی آراء مسلمان اہل علم کی عمومی آراء کی نمائندگی نہیں کرتیں۔

مستشرقین کے کام پر یہ ایک قسم کا رسپانس تھا، اس ضمن میں مستشرقین کے جواب میں ایک اور رسپانس دنیا کے مختلف علاقوں کے اندر اہل علم کے ہاں "اینٹی استشراق" تحریک کی صورت سامنے آیا، یہ اہل علم مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں۔ ان مصنفین کو مستشرقین سے یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ مختلف اہل مذاہب کی ایسی تاریخ لکھتے ہیں جو انھیں احساس کمتری کا شکار کرتی ہے، لہذا ان مستشرقین کو رد کرنا ضروری ہے۔ امام شافعی کے تناظر میں ایسی تحریر لکھنے والے اہل علم میں ایک اہم نام جناب وائل حلاق صاحب کا ہے۔ آپ نے 1993 کے اپنے ایک مقالے (Was al-Shafii the Master Architect of Islamic Jurisprudence?) میں تاریخی تجزیات کی بنیاد پر اس رائے کا اظہار کیا کہ امام شافعی کو اصول فقہ کا ماسٹر آرکیٹکٹ کہنا غلط ہے، آپ کی کتاب "الرسالۃ" کا اصول فقہ کی تشکیل میں نہ خاص کردار ہے اور نہ ہی آپ کے خیالات کو کم از کم 100 سال تک کوئی اہمیت دی گئی۔ آپ کی کتاب الرسالۃ ایک

ابتدائی نوعیت کی چیز تھی نہ کہ حرف آخر (یہ دعوی مسلمانوں میں سے کسی نے کیا بھی نہیں کہ آپ کا کام حرف آخر تھا) بلکہ یہ کتاب اصول فقہ کے بجائے اصول حدیث سے متعلق ہے۔ مسلمانوں نے آپ کے بعد اس علم کو مزید ترقی دی اور جسے آج اصول فقہ کہتے ہیں، وہ تیسری و چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی باہمی بحث و تمحیص کے بعد پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں سامنے آیا اور اس ضمن میں وہ قاضی باقلانی (م 403ھ) کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ بات سمجھ نہیں آسکی کہ آخر علامہ جصاص (م 370ھ) کو وہ اس ضمن میں کیوں کر اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں جنھوں نے "الفصول فی الاصول" کے نام سے اس فن پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔

حلاق صاحب کے اس تجزیے پر مختلف اہل علم، بشمول مستشرقین اور اہل اسلام، کا ردعمل سامنے آیا۔ اس ردعمل کو دو بنیادی نکات میں سمویا جاسکتا ہے:

(۱) یہ دیکھنا کہ تیسری و چوتھی صدی ہجری کے دوران امام شافعی کو کس قسم کا رسپانس ملا۔

(۲) یہ دیکھنا کہ امام شافعی کی "الرسالۃ" اور امام جصاص کی "الفصول" کے درمیانی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ دور میں اصول فقہ پر کس نوعیت کا کام ہوا؛ تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ الرسالہ کا ان کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔

اس ضمن میں متعدد اہل علم نے اپنی تحقیقات پیش کیں جو حلاق صاحب کے درج بالا مقدمات کی تردید کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان تمام تحریرات کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں، تاہم بحث و جواب کی نوعیت سمجھنے میں احمد الشمسی کی The A:Canonization of Islamic Law Social and Intellectual History نیز احمد تامل صاحب کے پی ایچ ڈی مقالے The Missing :Link in the History of Islamic Legal Theory:The Development of Usool -Fiqh between-al Shafi and Al-Jassas during the 3rd(9th)and Early 4th(10 th) centuries کا مطالعہ سود مند ہوگا۔ بدقسمتی سے تیسری و چوتھی صدی ہجری کے دوران اصول فقہ پر لکھی جانے والی اکثر کتب ہمیں میسر نہیں، تاہم پچھلے کچھ عرصے میں محققین مختلف لائبریریز میں محفوظ بعض مخطوطات کو ایڈٹ کر کے سامنے لائے ہیں جیسے شافعی عالم سرتج (م 306ھ/ 918ء) کی فقہ کی کتاب کا وہ حصہ جو اصول فقہ پر مبنی ہے، اور اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے نصف میں انتقال کرنے والے شافعی عالم الخفاف کی کتاب کا اصولی مقدمہ۔ یہ دونوں مخطوطات احمد الشمسی صاحب نے اپنے مقالے Two Early :Bridging the Gap Texts of Islamic Legal Theory میں جمع کر دیے ہیں۔

امام شافعی کی کتاب "الرسالۃ" کے بارے میں مستشرق نارمین کالڈر (Norman Calder) نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ یہ کتاب آپ نے نہیں؛ بلکہ بعد کے دور کے کسی شافعی عالم نے تحریر کی ہے، اس کی وجہ محقق کے خیال میں یہ ہے کہ کتاب کے مباحث خاصے ایڈوانس نوعیت کے ہیں جنھیں دوسری صدی ہجری میں پیش کیا جاسکنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اہل علم نے اسلامی علوم کے متعدد داخلی شواھد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ رائے غلط ہے۔ مثلا ابو یعقوب بویطی (پیدائش اندازاً 170ھ- متوفی 231ھ) امام شافعی کے ایک شاگرد تھے۔ آپ نے "مختصر" کے نام سے امام شافعی کے "الرسالۃ" کا خلاصہ لکھا جسے محققین نے کچھ سال قبل مخطوطات سے تصنیف میں ڈھال دیا ہے اور احمد الشمسی نے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح مشہور

معتزلی عالم جاحظ (م 255ھ) کے رسالے "رد ھاشم علی ادعاء اُمیۃ البسالۃ" میں اس کتاب کا ذکر موجود ہے۔ الغرض اس نوع کے متعدد نظائر یہ ثابت کرتے ہیں کہ الرسالۃ امام صاحب ہی کی تصنیف تھی۔

ان محققین کو جواب دینے کے لئے حلاق صاحب نے 2019 میں

Usul al- fiqh and Shafi's Risala Revisited

کے نام سے ایک تفصیلی مقالہ لکھا۔ اس تحریر میں حلاق صاحب کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ کسی علم کے اصول فقہ کہلائے جانے کے لiy جن پانچ شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، ان شرائط پر امام شافعی کی الرسالۃ تو کجا پانچویں صدی ہجری کی اکثر کتب بھی ان پر بمشکل پورا اترتی ہیں۔ یہ پانچ شرائج درج ذیل ہیں:

(الف)۔ چار ماخذات دین یعنی قرآن، سنت، اجماع و قیاس کا واضح تصور ہونا۔ حلاق صاحب نے ایک مستشرق جوزف لوری کی تحقیق (Does Shafi have a Theory of Four Sources of Law?) پر اعتماد کرتے ہوئے اس رائے کو اختیار کیا کہ امام صاحب کے ہاں اس کا تصور موجود نہیں (یہ صراحتاً ایک غلط رائے ہے کیونکہ آپ کی کتب "الرسالۃ" و "الام" میں صریح عبارات میں ان چار کا بالترتیب ذکر موجود ہے)

(ب) ان چار ماخذات کا ترتیب وار لحاظ کیے جانے کا ادراک ہونا؛ کیونکہ ترتیب بدلنے سے بہت فرق پڑتا ہے۔ حلاق صاحب کی رائے میں اس ترتیب کے وجوب کا واضح ادراک قاضی باقلانی کے ہاں ملتا ہے۔

(ج) ایسے علم کے وجود کا ادراک ہونا جو فقہ سے الگ و بلند تر اصول وقواعد سے بحث کرتا ہو اور اس کے ماہرین کے ہاں "ادلۃ اجمالیۃ" کا واضح تصور پایا جائے۔

(د) اپنی الگ شناخت کا شعور رکھنے والے یعنی (self-conscious-) علم کا وجود ہونا، یعنی ایک ایسا علم جو خود اپنے اصول وقواعد کا جواز وشعور رکھتا ہو کہ اس علم کا مقصد واسکوپ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حلاق صاحب کے خیال میں اصول فقہ پر یہ دور جوینی (م 478ھ) وغزالی (م 505ھ) وسرخسی (م 483ھ) تک پہنچ کر آتا ہے۔

(ح) اصول فقہ الگ سے ایک نوع ہو جسے ضبط تحریر میں لانے کا ایک منفرد انداز ہو، اور اس کے ماہرین کی منفرد کمیونٹی الگ سے پہچانی جاتی ہو۔ ان کے خیال میں علامہ باقلانی کے دور کے بعد اس نوع کے وجود کی ابتدا ہوئی۔

چنانچہ ان شرائط کو بنیاد بنا کر وہ الرسالۃ کو اصول فقہ کے لیے ایک غیر ضروری نہ سہی تو کم از کم بالکل ابتدائی نوعیت کی ایک چیز دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاہم حلاق صاحب کے اس تجزیے پر ذہن میں درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) کیا کسی نے امام شافعی کو انھی پانچ شرائط کے معنی میں اصول فقہ کا ماسٹر آرکیٹیکٹ کہا تھا کہ حلاق صاحب نے اسے بنیاد بنا کر یہ مقدمہ رد کیا؟ اگر ایسا کسی نے نہیں کہا تو یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ آخر حلاق صاحب نے ردکس کا لکھا؟ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 1993 کے مقدمے کے دفاع کے لیے انھوں نے ایسی سخت شرائط مقرر کیں۔

(۲) حلاق صاحب کا 1993 کا مقدمہ زیادہ تر تاریخی نوعیت کا تھا جس پر ناقدین نے تاریخی شواھد کے ذریعے ان کے مقدمے کی غلطی کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن 2019 میں حلاق صاحب نے تاریخی کے بجائے تجزیاتی گراؤنڈ پر اپنا دفاع کیا کہ جن شواہد کو ناقدین نے پیش کیا وہ کیونکر اصول فقہ کہلانے کے مستحق نہیں۔ اس اعتبار سے حلاق صاحب کے دو مقالہ جات کی بحث میں بظاہر ربط محسوس

نہیں ہوتا۔

(۳) کسی علم کے اصول فقہ کہلائے جانے کے لیے خود ان پانچ شرائط کی علمی حیثیت کیا ہے؟ کیا ماضی کے مسلمان اہل علم میں سے کسی نے ایسی شرائط پیش کیں؟ ممکن ہے حلاق صاحب اس سوال کو غیر ضروری قرار دیں؛ لیکن اہل اسلام کے روایتی طبقے کے لیے یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس طرح پھر کوئی بھی ماہر اپنی طرف سے ایسی مزید سخت شرائط عائد کر کے اصول فقہ کی ڈویلپمنٹ کو مزید دو تین صدیاں آگے دھکیل سکتا ہے۔

(۴) حلاق صاحب کا یہ تجزیہ مستشرقین کے اس اعتراض کا جواب کیسے دیتا ہے کہ "اصول فقہ و فقہ دو الگ قسم کے علوم تھے اور اصول فقہ بہت بعد کی پیداوار ہے"، یہ واضح نہیں ہو پاتا؛ بلکہ ان کی تحقیق سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے چار سو سال تک بغیر کسی واضح تصور اصول کے فقہ کی تشکیل جاری رکھی۔

(۵) حلاق صاحب کی شرائط کا حاصل یہ ہے:
(الف) سڑک کا مطلب 240 فٹ چوڑی سڑک ہے جس کے ہر طرف 3 بسیں بیک وقت کراس کر سکیں، (ب) ایسی سڑک کی تعریف پر پاکستان میں موٹروے پورا اترتی ہے، (ج) پاکستان میں موٹروے 1997 میں بنی، (د) لہذا پاکستان میں سڑک 1997 میں بنی، اس سے پہلے پاکستان میں سڑک نہیں تھی۔

مستشرقین کے جواب میں امام شافعی کے کام کے تناظر میں ایک اہم رائے محترم عمران احسن نیازی صاحب کی بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب نے مستشرقین کو جواب دیتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ائمہ احناف کے ہاں ماخذ شرع اور اصول وقواعد کا واضح ادراک پایا جاتا تھا، اگرچہ انہوں نے اس موضوع پر کوئی باضابطہ تحریر نہ لکھی ہو۔ آپ کے شاگرد محترم عمران احسن نیازی صاحب اپنی کتاب Theories of Islamic Law میں آپ کے اس تجزیے پر یہ اضافہ فرماتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ائمہ احناف و مالکیہ امام شافعی سے قبل اصول وضع فرما رہے تھے؛ بلکہ ان کے کام کی نوعیت امام شافعی کے کام اور ان کے نظریہ اصول سے مختلف تھی۔ آپ کے نزدیک مستشرقین کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ان دو مناہج اصول کو ایک فرض کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ امام شافعی اصول فقہ کے بانی تھے، جب کہ امام شافعی صرف اس کے ایک خاص منہج یا نظریے کے بانی تھے جسے وہ "حرفیت پسندی" (لٹرل ازم) کہتے ہیں۔ اس کے برعکس ان سے قبل فقہائے احناف نے جس نظریے کی بنیاد ڈالی اسے وہ نظریہ اصولیت پسندی (theory of general principles) کہتے ہیں اور مشائخ احناف نے بعد میں اپنے ائمہ سے منقول جزئیات سے اپنا اصولی نظام الگ سے وضع کیا۔ تاہم مستشرقین ان دو نظاموں کو الگ کرنے کے بجائے اصول فقہ کو " کلاسیکل اسلامک تھیوری" کے عنوان میں بند کر کے اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ امام شافعی گویا ہر قسم کے اصول فقہ کے بانی تھے۔ نیازی صاحب کے مطابق امام شافعی کے پیش نظر دین کے اس حصے کے لیے جسے وہ "فکسڈ پارٹ" کہتے ہیں، ایسی میتھاڈولوجی وضع کرنا تھا جو نصوص کے ظاہری معنی کے اندر یا اس سے قریب رہتے ہوئے اخذ احکام کو ممکن بنائے جبکہ فقہائے احناف اس سے زیادہ عمومی سطح پر قواعد عامہ اخذ کرنے کا فریم ورک تیار کر رہے تھے۔

اس طرز استدلال سے وہ مستشرقین کا یہ تاثر غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امام شافعی سے قبل اصول فقہ کا وجود نہ تھا۔ اسلامی تاریخ میں تعبیر نصوص کے دو مناہج رہے ہیں، یہ بات اس معنی میں درست ہے کہ الفاظ و معنی کے فہم کا ایک نظریہ قائلین قیاس کا تھا جب کہ دوسرا نظریہ منکرین قیاس کا (جس کی

مثالیں ابتدائی صدیوں میں النظام معتزلی، مکتب اہل تشیع اور گروہ خوارج کی صورت نظر آتی ہیں)۔ چنانچہ محترم نیازی صاحب کے استدلال کے درست ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ امام شافعی کو علمائے ظاہریہ جیسے منکرین قیاس کی صفوں کے قریب کیا جائے تاکہ یہ بات ثابت ہو سکے کہ امام شافعی پوری طرح سے اس اصولی منہج کی نمائندگی نہیں کرتے جس کی بنیاد ائمہ احناف وغیرہ نے ڈالی بلکہ آپ کا نظریہ اصول احناف سے مختلف نوعیت کا تھا۔ اسی لئے نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ امام شافعی کے خیالات اسی گروہ سے قربت رکھتے ہیں جس میں علامہ داؤد ظاہری آتے ہیں اور اس کی دلیل آپ کے نزدیک یہ ہے کہ امام صاحب کے قیاس کا تصور قیاس اولی اور قیاس شبہ تک محدود ہے، اول الذکر کے قیاس ہونے ہی میں اختلاف ہے کیونکہ احناف اسے دلالۃ النص کہتے ہیں جب کہ موخر الذکر ان کے نزدیک تحقیق مناط سے عبارت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیاس کا وہ تصور جسے اہل فقہ قیاس علت کہتے ہیں، امام شافعی کے ہاں اس کا ادراک نہیں ملتا۔ آپ کے اصول فقہ میں قیاس کی بحثوں پر یہ اضافہ جات کئی صدیوں بعد امام جوینی و غزالی نے کئے اور اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ امام شافعی کے ہاں "تخریج مناط" کا وہ تصور نہیں پایا جاتا جس کی بات امام غزالی کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ آپ کے نزدیک یہ ہے کہ امام شافعی کا اصل منہج لٹرل ازم تھا اور احناف کی طرح جنرل پرنسپلز کی دریافت وغیرہ آپ کے پیش نظر نہ تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے استحسان کے حنفی تصور کو رد کیا جو گویا اخذ قواعد کی ایک الگ میتھاڈولوجی کا مظہر تھا۔ چنانچہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعی نے ایک ایسے اصول فقہ کی بنیاد رکھی جو اپنے سے پیش رو فقہا کے مقابلے میں تنگ تھی اور نیازی صاحب کے مطابق اسی لیے امام شافعی کی فقہ کو ڈولپ ہونے میں دو صدیوں سے بھی زیادہ وقت لگا اور آپ کے نظریات فقہی مباحث پر زیادہ اثر نہ ڈال سکے، بعد کے دور میں شافعی علماء کے ہاں آپ کے نظریات کو اخذ و ترمیم کے ساتھ قبول کیا گیا۔

امام شافعی کے تصور اصول فقہ کی بحث میں محترم نیازی صاحب کا یہ مقدمہ ایک دلچسپ اضافہ ہے کہ انھوں نے اس کے ذریعے مستشرقین کے مقدمے کا جواب دینے کی کوشش کی۔ (آپ کے مطابق اصول فقہ میں اخذ احکام کی ایک نہیں بلکہ تین تھیوریز پائی جاتی ہیں، درج بالا دو کے سوا تیسری تھیوری امام غزالی نے "مقاصد شریعت" کے تناظر میں وضع کی جسے تاحال پوری طرح برتا نہیں جا سکا)۔ امام شافعی کے بارے میں محترم نیازی صاحب کے اس مقدمے کے حوالے سے تاحال ایسی کوئی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری جس میں اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہو، آپ کی اس کتاب پر جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب نے تقریظ لکھتے ہوئے ان کی تحقیق و نتائج فکر کی تحسین فرمائی ہے۔ تاہم نیازی صاحب کی طرف سے امام شافعی کے تصور قیاس کو انڈر ڈولپ یا محدود ثابت کر کے انھیں علامہ داؤد ظاہری جیسے حرفیت پسندوں کا پیش رو کہنا اور ان کے منہج اصول کو احناف و مالکیہ کے منہج سے الگ ثابت کرنا محل نظر مقدمات ہیں۔ ان مقدمات کا جائزہ لینے کے لئے اقسام قیاس، مسالک علت و استحسان کی بحثوں کی روشنی میں امام شافعی کی عبارات اور ان کی امثلہ پر بحث کر کے ائمہ و مشائخ احناف کی آراء کے ساتھ اس کے موازنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ کیا اسلامی تاریخ میں علمائے شوافع و احناف نے خود ایسی کسی رائے کا اظہار کیا کہ امام شافعی کا منہج علمائے ظاہریہ جیسا تھا نیز آپ کے ہاں قیاس علت جیسے تصورات نہیں پائے جاتے؟

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ، پاکستان دسمبر ۲۰۲۱)

☆☆☆

❑ تجزیہ

تحریک اسلامی
موجودہ صورت حال اور ممکنہ آفاق ومیدان

تحریر: شیخ راشد الغنوشی
ترجمہ: محمد فرید حبیب ندوی

شیخ محمد راشد الغنوشی تیونس کے معروف مفکر وعالم ہیں۔ان کی دودرجن سے زائد کتابیں ہیں جو دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ان کی ایک معروف کتاب ''الحرکۃ الاسلامیۃ ومسئلۃ التغییر'' کے نام سے ہے۔اِن صفحات میں اِسی کتاب کا ترجمہ قسط وار پیش کیا جائیگا۔یہ اُس کی پہلی قسط ہے)۔

تحریک اسلامی سے ہماری مراد وہ تمام سرگرمیاں ہیں جو اسلام کے مقاصد کی تحقیق وتکمیل اور ہر زمانے کی صورت حال کے دباؤ سے پیدا ہونے والے تجدد کو صحیح رخ دینے کے مقصد سے اسلامی جذبات کے ساتھ پیدا ہوئیں۔اسلامی تحریکوں کی ضرورت اس لیے ہے ؛کیوں کہ اسلام ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے آیا ہے،اس لیے لازم ہے کہ اس کا پیغام جگہ اور زمانے کے حالات کے بدلنے کی وجہ سے نئے رنگ وآہنگ میں پیش کیا جائے ،اور یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے مقاصد،اس کی حکمت عملی اور وسائل، زمان ومکان کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔

جب ہم تحریک اسلامی کی تاریخ یعنی انقطاعِ وحی اور امت کے پیام دعوت کو سنبھالنے سے لے کر اب تک کی تجددِ اسلام کی تاریخ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں ،تو عمومی انداز میں ہم پاتے ہیں کہ جب تک اسلام کی قانونی حیثیت کا اعتراف کیا جاتا رہا، تو زیادہ تر اسلامی تحریک کا رخ اصلاحی انداز لیے ہوئے تھا، چنانچہ علما خلل وفساد کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا راستہ اختیار کرتے تھے۔یہ اسلوب ومنہج اس وقت تک قائم رہا، جب تک اسلام کو قانونی بالادستی حاصل رہی۔اور اس کی آخری شکل بھی خلافت عثمانیہ کے سقوط کے ساتھ ختم ہوگئی۔

پھر علما کے درمیان ایک نیا شعور پیدا ہوا، جس کی انتہا ایک ایسے نئے مرحلے پر ہوئی ، جس سے مسلمان چودہ صدیوں میں کبھی واقف نہیں رہے تھے؛اس لیے کہ اب حکومت اسلامی نہیں رہی تھی اور نہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی تھی ؛ بلکہ اب تو ظالمانہ سیکولرزم تھا، جو بیرونی اشاروں کے تابع تھا۔اس وقت سے اصلاحی تحریک نے ایک نئی شکل اختیار کی۔

اور پھر جب حکومت نے قانون سازی کے لیے صراحۃً یا ضمناً ہر طرح اسلام اور امت سے اپنا رشتہ ختم کرلیا، تو تحریک اسلامی کا مقصد یہ قرار پایا کہ اسلام کی کھوئی ہوئی قانونی

حیثیت کو بحال کیا جائے، چنانچہ شیخ حسن البنا شہیدؒ کی قیادت میں سقوط خلافت کے تین سال بعد ہی اخوان المسلمین کی تحریک وجود میں آئی، اور اس نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا جو اصلاح کے تمام قدیم اسالیب سے مختلف تھا۔ اور دنیا کے گوشے گوشے میں تجدید کی تحریک برپا ہوگئی، جس کا مقصد اسلام کی قانونی بالادستی کی بحالی تھا، اور جس کا نعرہ شریعت کی ایسی عمومی تطبیق تھا، جو ثقافت و تعلیم، فکر و نظر، اقتصادیات، علوم وفنون اور قضاء و سیاست سب کو محیط ہو۔ اس تحریک کا اصل محرک دراصل یہ احساس تھا کہ سقوطِ خلافت کے بعد اب اسلام کہیں بھی حاکم نہیں رہ گیا ہے اور ساری دنیا پر سیکولرزم نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل سنت اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں اسلام کو حکومت میں باقی سمجھتے رہے، اس لیے انھوں نے کسی بڑے منظّم اصلاحی عمل کی ضرورت ہی نہ سمجھی؛ بلکہ ہر دور میں انفرادی اصلاح کا عمل ہوتا رہا۔ البتہ شیعہ حضرات کا معاملہ ذرا مختلف رہا۔ انھوں نے اپنے وقت کی کسی بھی اسلامی حکومت کا کبھی اعتراف نہیں کیا، چاہے اموی حکومت ہو یا عباسی یا فاطمی، یا ممالیک کی حکومت ہو یا عثمانی خلافت۔ انھوں نے پوری تاریخ میں خود کو منظّم رکھا، اور ایسی تحریکیں برپا کیں جو ڈھکے چھپے بھی اور کھلے عام بھی، اسلامی قانونی کی بحالی کے لیے مقابلہ اور معرکہ آرائی کرتی رہیں، جب کہ اہل سنت حکومت کو شرعی حکومت ہی تسلیم کرتے تھے، البتہ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ حکومت میں کچھ انحرافات در آئے ہیں۔ پھر جب خلافت عثمانی بھی ختم ہوگئی تو اہل سنت نے بھی مقابلہ آرائی کی روش اپنائی، اس لیے کہ اسلام اب کسی بھی طرح حکومت میں نہیں رہا تھا۔ اور اسی دوران ان کو یہ بھی احساس ہوا کہ اب اصلاح اور اسلام کی قانونی بالادستی کی بحالی کے لیے انفرادی کوششیں کافی نہیں ہوسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ''اسلامی انقلاب'' کا نعرہ دیا۔

اسلامی تحریک اب انقلابی مزاج رکھنے والی تحریک بن چکی تھی، جس کا مقصد محض چند چیزوں کی اصلاح نہیں تھا؛ بلکہ جڑ سے اور مکمل طور پر اصلاح کرنا اس کے پیشِ نظر تھا۔ اگرچہ حسن البنا شہیدؒ جیسے بعض حضرات ''ثورۃ'' (انقلاب) کی تعبیر استعمال کرنے سے بچتے رہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس اصطلاح میں انتشار و بدنظمی، خوں ریزی اور ظلم و زیادتی کا مفہوم شامل ہے، اور اس طرح شامل ہے کہ یہ لفظ آتے ہی ذہن خود بخود خوں ریزی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ انھی دنوں انقلاب کا نعرہ سوڈان اور ایران میں خوب مقبول رہا۔ اور اعتبار تو مفہوم کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ تقریباً سب کے نزدیک ہی اپنے اندر انقلابی مفہوم رکھتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے اصلاح کا مطلب یہ ہوا کہ اب جب کہ اسلام کا دورِ عروج ختم ہو چکا ہے، ایک بار پھر سے اسلامی تہذیب کی سربلندی کا ایک نیا دور لایا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی اصلاح و تعمیر کا عمل جڑ اور بنیاد سے شروع ہو۔

مذکورہ تفصیل سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ سقوط خلافت کے بعد قائم ہونے والی تحریک اسلامی کا انقلابی مزاج اصلاح و تبدیلی کے لیے طاقت کے استعمال کا تقاضا کرتا ہے؛ بلکہ میری مراد یہ ہے کہ اس کی تبدیلی کا عمل جڑ اور بنیاد سے متعلق ہے، صرف ظاہری اور اوپری چیزوں سے نہیں۔ اب چاہے یہ مقصد بتدریج پورا ہو اور وسائلِ امن سے ہی حاصل ہوجائے؛ البتہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود

حکومت کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

چونکہ اسلام کی قانونی حیثیت مغربی سامراج کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی، اس لیے اسلامی تحریک نے خود کو دو محاذوں پر معرکہ آرا پایا: ایک محاذ تھا مغربی سامراج سے مقابلے کا، یعنی عالم اسلامی سے اجنبی وجود کو نکال باہر کرنے کا، اور دوسرا محاذ تھا: کھوئی ہوئی قانونی حیثیت کی بحالی کا۔ اسلامی تحریک کو بیک وقت ان دونوں محاذوں پر کام کرنا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ امت کو بیدار کرنے کے لیے اسلامی تحریک (جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے قائم ہے) پہلے محاذ یعنی عالم اسلامی سے اجنبی وجود کو باہر کرنے میں اچھی طرح کامیاب رہی، چنانچہ تحریک اسلامی عالم اسلامی کے اکثر حصے کو مغربی تسلط سے آزاد کرا چکی ہے، اب بس فلسطین، بلقان، کشمیر اور بعض ایسے علاقے ہی باقی رہے گئے ہیں، جہاں انھیں اجنبی فوج سے معرکہ آرائی کا سامنا ہے۔ اور تحریک اسلامی ان باقی مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے ابھی بھی سرگرم عمل ہے۔

ہم موجودہ مسلمانوں کے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ ہماری سابقہ نسلوں (سلف) نے مغرب کے ساتھ جہاد برپا رکھا، باوجود اس کے کہ ہماری طاقت مغرب کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی، اسی جہاد کا اثر تھا کہ ہمارے علاقے اجنبی وجود سے پاک ہوئے، اگر چہ یہ جہاد قومی تحریک (وطنیت) کے نعرے اور جھنڈے تلے ہوا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاد پر ابھارنے اور اس کے لیے مہمیز کرنے والا اصلاً اسلام ہی تھا، اور قومی تحریک کے قائد باوجود اس کے کہ ان پر -جیسا کہ بعض حضرات کی رائے ہے- مغربی چھاپ نمایاں تھی، مساجد سے ہی نکلتے تھے اور امت کو قربانی کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے نام پر ہی دعوت دیتے تھے، اور خود عوام بھی ان کی دعوت کو ایمان اور جذبۂ جہاد کی وجہ سے تسلیم کرتے تھے۔

اس لیے اس دور میں اسلامی تحریک کی طرف سے جو کوششیں ہوئیں، بعد میں پیدا ہونے والے انحرافات سے ان پر کچھ فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی انھیں کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے؛ اس لیے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب امت مغرب زدہ ہو چکی تھی اور اپنی حقیقت کی متلاشی تھی۔ (ان حالات میں اتنا بھی کر پانا بہت ہے)۔

جب ہماری سابقہ نسل اسلامی ممالک سے اجنبی فوجی وجود کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئی، تو اب ہماری موجودہ نسل سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ دوسرے محاذوں پر معرکہ کو جاری رکھے؛ تاکہ امت اقتصاد و ثقافت اور سیاست کے میدان میں بھی خارجی اثر و رسوخ سے چھٹکارا پا سکے۔ اس وقت مقابلہ کا اصل میدان یہی ہے۔

اقتصادی میدان میں کشمکش کے محاذ میں بھی آزادی و خود مختاری کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے، اور ابھی مزید کوششوں کی ضرورت ہے، تاکہ اقتصادی خود مختاری کے ذریعے سیاسی خود مختاری بھی حاصل ہو سکے۔ اسی پلیٹ فارم پر بہت سی مشترکہ تحریکیں اور یونینیں قائم ہوئیں، جو درحقیقت اقتصادی خود مختاری کے حصول کی کوشش و عمل کے ذریعے ایک دوسری اسلامی حیثیت کا حصول چاہتی تھیں، یعنی اس کی حیثیتِ مساوات کا۔ اس موقع پر ان تمام کوششوں کی سراہنا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو اجنبی اثر و رسوخ سے بے نیاز خود مختار ترقی کے لئے کی گئیں، خواہ وہ علمی تحقیقات کے میدان میں ہوں، یا یونینوں کے پلیٹ فارم سے، یا پھر حقیقی صورت حال کے تعلق سے۔ میں خاص کر ان یونینوں کا ذکر

کروں گا، جو ہماری امت کی اقتصادیات کو سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کے مقابلے میں صف آرا رہیں۔ اسی طرح اسلامی بینکنگ کا تجربہ بھی ہے، جسے عالم اسلام کی اقتصادی آزادی کے لیے اساسی محاذ یا بنیادی وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تجربہ کو ایسے بہت سے سخت حملوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جو اسے ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب اقتصاد و معاشیات عالمی کشمکش کا اصل میدان بن چکا ہے۔ اس لیے مسلم نوجوانوں کو اس بات کی دعوت دی جارہی ہے کہ وہ کمپنیاں اور سوسائٹیاں قائم کر کے آزاد اقتصادی عمل کے میدان کی طرف توجہ کریں اور اس میدان کو موجودہ زمانے میں اسلامی جہاد کا ایک میدان سمجھیں۔

تیسرا محاذ جس میں تحریک اسلامی کو کوشش کرنی ہے اور جس نے اسے ہمیشہ مشغول رکھا ہے اور آگے بھی رکھے گا، وہ ثقافتی محاذ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو عقل وضمیر اور قانون وسلوکیات کو مغربی ثقافتی حملوں سے آزاد کرایا جائے، اور دوسری طرف انحطاط و ناکامی کے اثرات ونتائج سے چھٹکارا دلایا جائے۔

اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان ایک عقل وسمجھ رکھنے والی مخلوق ہے، اسلام نے اخلاق وعادات کی تبدیلی سے پہلے عقیدۂ وفکر کے مسئلہ پر توجہ دی، اس لیے بنیادی طور پر عمل کی اہمیت کا دارمدار نیت کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ اس لیے اصلاح وتبدیلی کے سلسلے میں اسلام کا منہج یہ ہے کہ آغاز باطن یعنی عقائد، قدروں اور احساسات کی تبدیلی سے کیا جائے، اور اسے اخلاق وعادات کی تبدیلی کا راستہ اور زینہ بنایا جائے۔ ''إن اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا ما بأنفسهم ''۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اجتماعی تبدیلی لانے کے لیے محض فرد میں تبدیلی پیدا کردینا کافی ہے، یا اجتماعی تقاضوں کا -جن سے ہر فرد گھرا ہوتا ہے- خیال کیے بغیر اس کا حصول ممکن ہے؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ فرد اور خاندان کی تبدیلی کا عمل معاشرے کی تبدیلی تک پہنچادے گا۔ اس سلسلے میں استاد منیر شفیق کی ممتاز کتاب ''نظریات فی التغییر'' کا مطالعہ مناسب ہوگا۔

مسلمان کلمہ طیبہ کے مسئلہ پر سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں: ''ألم ترکیف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت وفرعها في السماء ،تؤتي أكلها كل حين بإذن ربها''۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین علماء کرام کا اصلاح وتبدیلی کے میدان میں سب سے بنیادی ہتھیار یہی کلمہ رہا ہے، یعنی معاشرے کی اصلاح کے لیے عقائد اور قدروں کی تبدیلی۔ اور آپ جیسے طلبہ کو چاہیے کہ ان کی کوششوں کا محور یہ ہو کہ کس طرح ثقافت وتہذیب، علوم وفنون اور افکار ونظریات کو اجنبی حملوں اور احساس شکست سے آزاد کرایا جائے۔ اسی کے ذریعے فکر اسلامی، حقائق اسلامی اور علم اجتماع، نفسیات، اقتصادیات، قانون اور ادب وغیرہ تمام میدانوں میں علوم اسلامی کا وجود پذیر ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے نبی ﷺ کا معجزہ کلمہ یعنی کتاب الٰہی ہے۔ اور دیگر انبیاء کے معجزات کے مقابلے میں، جو کہ سب مادی قسم کے تھے، اس معجزہ کی نمایاں حیثیت ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس عصا کا معجزہ تھا، جو سانپ بن جاتا تھا، کسی کے پاس سخت ترین بیماری کے علاج کا معجزہ تھا،

جب کہ نبی اسلام ﷺ کا معجزہ کلمہ ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اصلاح وتبدیلی کا منہج یہ ہے کہ مخاطب کو جھکانے کے بجائے اسے مطمئن کیا جائے۔اور آج ہم چینلز کے زمانے میں جی رہے ہیں،جن کا ارادہ ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کو مغربی انسان کی طرح بنادیں۔اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ہمارے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے اور اس نئے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے سخت محنت مطلوب ہے۔

امت مسلمہ کی تاریخ میں پیش آمدہ سب سے خطرناک (اس فکری) جنگ کا مقابلہ کرتے ہوئے تحریک اسلامی نے جوکوششیں کیں ،اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود بڑی حد تک کامیاب ہوئیں۔یہ کوششیں عالم اسلام پر چھائے ہوئے سیکولرزم کو سمیٹنے میں کامیاب رہیں،باوجود اس کے کہ سیکولرزم کو حکومت کی قوت حاصل تھی جب کہ اسلام اپوزیشن اور دفاع میں تھا۔اور سیکولرزم حکومت ذہن سازی کے تمام وسائل پر قابض تھی؛لیکن اس سب کے باوجود تحریک اسلامی سیکولرزم کو سمیٹنے میں کامیاب رہی۔اس کی دلیل وہ الیکشن ہیں،جو صاف شفاف طریقے سے کرائے گئے ،خواہ عالم اسلامی کے کسی بھی خطے میں ہوں اور جن میں زیادہ تر سیٹیں اسلام پسندوں کے حصے میں آئیں۔اور ڈکٹیٹر شپ کو شکست لاحق ہوئی۔اور اب صورت حال یہ ہے کہ اسلامی قلم کاروں،اسلامی جماعتوں،اسلامی مجلّات اور اسلامی بینکوں اور منصوبوں کے مدمقابل کوئی نہیں ہے،اور زیادہ تر جامعات میں طلبہ یونین کی ذمہ داری اسلام پسندوں کے ہاتھوں میں ہے۔یہ اسلامی تحریک کے حق میں اللہ کے فضل سے بڑی عظیم کامیابی ہے،حالانکہ وہ اپوزیشن میں تھی اور ظلم کا شکار تھی۔اور اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ عالم اسلام میں سیکولرزم کے پاس اپنے آئینی ودستوری ہونے کے اثبات کے لیے ظلم وزیادتی اور خارجی سپورٹ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔اور یہ ممکن نہیں کہ وہ بہت زیادہ دنوں تک وسائلِ قوت کی زبردستی مالک بنی رہے؛کیوں کہ اس کے پاس اپنے آئینی ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے؛اس لیے کہ انسانوں کو آزاد پیدا کیا گیا ہے،وہ اس بات کو ہمیشہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ان پر زور زبردستی سے حکومت کی جائے،حتی کہ وہ ایسی حکومت کو اس وقت بھی ٹھکرادیں گے ، جب وہ انھیں ان کے خوابوں کی تکمیل کے خواب بھی دکھائے۔پھر یہ بھی ہے کہ سیکولرفکر اپنے ہر وعدے میں جھوٹا ثابت ہوچکا ہے، چاہے ان وعدوں کا تعلق اقتصادی ترقی سے ہو ،فلسطین کی آزادی سے ہو یا اتحاد امت سے۔اسی طرح وہ وطنی اور قومی پلیٹ فارم پر قیامِ اتحاد میں بھی بری طرح ناکام ہوچکا ہے،حتی کہ وہ صرف عرب بلکہ عرب کے مختلف فرقوں کے درمیان ہی اتحاد نہ کراسکا۔ترکی عالم اسلامی سے الگ کردیا گیا،حتی کہ خود ترکی کے اندر سیکولرزم کی وجہ سے مختلف قومیتوں کے درمیان کشمکش جاری ہے، جب کہ اس سے پہلے کرد اور ترکوں یا عرب اور ترکوں کے درمیان کبھی جنگ نہیں پیش آئی تھی، یہ سب اس سیکولرزم پلاننگ کا نتیجہ ہے جس نے اس صدی کے شروع میں ہی اسلامی پلاننگ کو زبردستی ناممکن قرار دیا تھا، اس لیے عمارت کو وہ عنصر ہی نہ مل سکا جو اس کو مضبوط کرپاتا،اسلام ہی وہ سیمنٹ ہے جو امت کی تعمیر کو مضبوط کرسکتا تھا،اور جب اسے ہی الگ کردیا گیا،تو عمارت ازخود گر پڑی۔

اور جیسے جیسے سیکولر نظاموں کا ظلم وزیادتی ،خارجی حمایت اور صہیونی پلاننگ کے ساتھ اتحاد ومعاہدے پر اعتماد بڑھتا جارہا ہے،اسی حساب سے وہ اپنے وجود کا جواز کھوتے

جارہے ہیں، فی الحال ان کی پلاننگ یہ ہے کہ انتہا پسندی (بنیاد پرستی) کے مقابلے کا نعرہ لگا کر اسلام کے خلاف جنگ برپا کی جائے۔ یہ سارے نظام مفلس ہیں اور ان کے پاس کوئی آئینی دلیل نہیں ہے۔ عوام کے ذہنوں میں ان کی تصویر یہ بن چکی ہے کہ یہ نظام فساد پھیلانے والے، ڈکٹیٹرشپ اور اسلام کے خلاف جنگ پر مبنی ہیں۔ حتی کہ اب ان کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ وہ یا ان میں سے اکثر اسلام، قومیت اور وطنیت کے خلاف صہیونیوں کے ساتھ معاہدہ کرنے پر ٹوٹ رہے ہیں۔ صورت حال کو اس چیز نے اور بگاڑ دیا ہے کہ فی الحال ان کو مغربی حمایت کا حاصل ہوجانا بھی یقینی نہیں، اس لیے کہ خود مغرب اس وقت حیرانی وبدنظمی اور تہذیبی افلاس کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس افلاس کو اب تک خارجی دشمن یعنی کمیونزم نے روک رکھا تھا، مگر اب کمیونزم کے زوال نے لبرلزم کو بدنظمی وانتشار کی بدترین حالت میں پہنچا دیا ہے۔ اس وقت یورپ کے قلب بوسنیا میں جو ہولناک خوں ریزیاں ہورہی ہیں، وہ مغربی تہذیب کے بڑھاپے اور زوال کی واضح علامت ہیں۔ حالت یہ ہے کہ اب مغربی انسان ایسی انسانی قدروں کا بھی مالک نہیں رہا ہے، جس کے لیے وہ اپنی زندگی کی قربانی دے سکے۔ اور نہ ہی اب مغربی قیادت میں دنیا کی مشکلات کو حل کرنے کا دَم ہے۔ اس طرح عالم اسلامی میں پائے جانے والی سیکولر قیادتوں کی حالت یتیم کے مشابہ ہوگئی ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ عالم اسلام میں موجودہ سیکولر پارٹیاں بھی بڑھاپے کی حالت میں ہیں، آپ ان کی کسی بھی میٹنگ میں یہ چیز بآسانی محسوس کرسکتے ہیں، حاضرین کی تعداد میں بھی اور شرکاء کی عمر کے اعتبار سے بھی، جب کہ آپ دیکھیں گے کہ اسلام پسندوں کی میٹنگوں میں بھیڑ امڈ آئی ہے، اور حاضرین میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں نسلوں کے درمیان توارث کو روکنے کے لیے زیادتی سے کام لے رہی ہیں، اس لیے کہ ان کی نسل تو اب بوڑھی ہوچکی ہے، وہ اپنے بعد کسی نئی نسل کو چھوڑ کر نہیں جانے والی، جب کہ اسلام پسندوں کی نسل پے بہ پے آرہی ہے۔ مثال کے طور پر تیونس کی جیلوں میں تیس ہزار سے زیادہ (اسلام پسند) قید ہیں، باوجود اس کے کہ تیونس عرب ممالک میں سب سے پہلے سیکولرزم کو قبول کرنے والا تھا۔ تیونس، الجزائر، مصر اور اس طرح کے دیگر ممالک میں ظلم وزیادتی کی یہ کارروائیاں سیکولرزم کے بڑھاپے اور اس عظیم خلا کی داستان بیان کررہی ہیں، جو دن بدن سیکولرزم اور اسلام پسند نمائندوں کے درمیان اور اسی طرح حکومت اور معاشرے کے درمیان وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے، حکومت میں باقی رہنے اور اپنے امتیازات کو بچانے کی اس ناکام کوشش میں یہ لوگ وحشیانہ تشدد اور ظلم پر اتر آئے ہیں۔ یہ ایسی نسل ہے جو آنے والی نسل پر اس خوف سے ظلم کررہی ہے کہ کہیں وہ اس کی جگہ نہ لے لے اور اس کے امتیازات کو ختم نہ کردے۔

سرزمین اسلام میں اسلام اور سیکولرزم کے درمیان برپا اس کشمکش کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ مستقبل اسلام کا ہی ہوگا۔ یہی بات پانچویں دہائی میں سید قطبؒ نے اس وقت کہی تھی، جب کہ وہ ڈکٹیٹر سیکولرزم کی جیل میں قید تھے، اور اس وقت تحریک اسلامی کا اثر بہت محدود اور سیکولرزم کا دائرہ افق تک وسیع تھا اور کمیونزم اور سیکولر قومیت کی حکمرانی قائم تھی۔ اور اب جب کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا اور (بالخصوص) عالم اسلام میں سیکولرزم کا محل زمین بوس ہورہا ہے، ہم یہ بات پورے وثوق اور اطمینان سے کہہ

رہے ہیں، کہ مستقبل مذہبِ اسلام کا ہے۔اور اسلام آزادی کے حصول اور سیکولرزم کے خاتمے کے اس معرکے کو سر کرنے کے بعد عنقریب حکومت کے لیے اپنی آئینی حیثیت کو بحال کرلے گا،اور خاندان وقبیلوں ، مافیاؤں کی حکومتوں اور سیکولر تسلط وعناد کے ملبے پر شورائی اور جمہوری حکومت قائم کرے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قافلہ رواں دواں ہے اور کئی جگہ اسلامی حکومت کی کرنیں چمکنے لگی ہیں۔اور اِن شاءاللہ تحریک اسلامی چند سالوں میں ہی اس سمت میں مزید آگے بڑھے گی۔

البتہ ہمارے سامنے کچھ ایسے اسباب بھی ہیں، جو اس قریبی امید کے حصول میں معاون ہیں،اور کچھ رکاوٹیں بھی ہیں۔معاون اسباب یہ ہیں:

۱۔ اسلام کی اندرونی قوت:

اسلام فطرت سے ہم آہنگ مذہب ہے،وہ عالم واَن پڑھ اور مرد وعورت ہر ایک کے دل کی آواز بن سکتا ہے،وہ ہر معیار پر فطرت کی رعایت رکھتا ہے۔اس میدان میں کوئی بھی مذہب،اسلام کی ہم سری نہیں کرسکتا۔

۲۔ فریق مخالف-سیکولرزم-کا بوڑھا ہونا:

ملکی اور عالمی سطح پر اسلام کا فریق مخالف بوڑھا ہو چکا ہے،اب اس کے پاس ملکی یا عالمی سطح پر کوئی ایسا نظریہ (آئیڈیالوجی) نہیں ہے، جو دلوں کو اپیل کرنے ،امن وانصاف قائم کرنے اور دین ودنیا کی سعادت کی خوش خبری دینے میں اسلام کا مقابلہ کرسکے۔

۳۔ دوسرے نظاموں کا ناکام ہونا:

دوسرے تمام نظاموں کی ناکامی نے تحریک اسلامی کی ایک طرح سے بڑی خدمت کی ہے،اس لیے کہ دشمن کی ناکامی وپسپائی مدد کو جلدی لادیتی ہے،اور قوموں کو ان کا بدل تلاش کرنے پر ابھارتی ہے۔

۴۔ مسلم عوام کے دلوں میں اسلام کے اثرات کا گہرا ہونا:

ایک داعی کو اللہ کے بعد امت پر بھروسہ کرنا چاہیے،اس لیے عوام کو حقیر سمجھنے سے بچو، بے شک اسلام ان کے دلوں میں جاگزیں ہے،اور میراث نبوت ابھی بھی ان کے قلوب میں پیوست ہے،گرچہ ان کے ظاہری اعمال اس کے خلاف نظر آتے ہیں،اس کی مثال تیونس میں دیکھی جاسکتی ہے، یہ بس ایک چھلکا ہے جو جلد ہی ہٹ جائے گا اور پھر اسلام کا سیلاب امڈ پڑے گا۔

۵۔ عالم اسلام کے طویل انقلابات۔

۶۔ مواصلات کے ذرائع کی ترقی:

چونکہ اسلامی فکر ونظریہ اپنے اندر کشش رکھتا ہے،اس لیے اس میدان میں ترقی اس کے حق میں مفید ہوگی،اس لیے ضروری ہے کہ آپ مواصلات کے جدید ذرائع کا خوب استعمال کریں، جیسے ٹی وی چینلز اور سوشل سائٹس، مثلاً انٹرنیٹ۔

۷۔ مغرب میں اسلام کی اشاعت:

یہ ایسا نفع ہے ،جو تاریخ میں اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا،مگر اپنی اہمیت کے باوجود یہ نفع ابھی یقینی نہیں ہے؛اس لیے کہ بہت سی طاقتیں مغرب میں اسلامی وجود کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں،خاص کر صہیونی تحریک ، جو مغرب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل لگی ہے،حتی کہ بعض مسلم حکمراں بھی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی سازشوں میں شریک ہیں، جو کچھ آج کل بوسنیا میں ہورہا ہے، بہت ممکن ہے کہ یورپ کے ان علاقوں میں بھی پیش آنے لگے، جہاں مسلم اقلیتیں رہتی ہیں۔اس لیے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مغرب میں آزاد ذہن رکھنے والی طاقتوں

سے قریب ہوا جائے، اس طرح کے لوگ تحقیقی اکیڈمیوں اور صحافت میں خوب موجود ہیں؛ اس لیے کہ اسلام اگرچہ ایک اعتبار سے -فرانسیسی محقق فرانسو بورغاٹ کے الفاظ میں- ''جنوب کی آواز ہے''، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مشرقی ہے، نہ مغربی، وہ پوری انسانیت کا دین ہے، اور اس وقت اس کی جتنی ضرورت ہماری قوم کو ہے، مغرب کو بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ اگرچہ دعوت اسلامی کے راستے میں بہت سے رہزن بیٹھے ہیں، جن میں سرفہرست یہودی حکومت، صہیونی تحریک اور ان کے ایجنٹ منافق وشکست پسند حکمراں ہیں۔

جہاں تک تحریک اسلامی کی رکاوٹوں کی بات ہے، تو وہ بھی کم نہیں، ہم یہاں ان رکاوٹوں کو بیان کریں گے جو اسلامی صف کے اندر ہیں:

۱۔ **فکری جمود:** تجدد سے بے زاری اور پرانی چیزوں کی تقلید، یہ جمود ان قدیم مسالک وآراء کے سلسلے میں ہے، جو زمان ومکان کے جدید تغیرات سے میل نہیں کھاتے ہیں۔

۲۔ **قومیت:** اگرچہ ہم بنیادی طور پر کسی اسلام پسند کو قومیت پرست نہیں کہہ سکتے، مگر یہ حقیقت ہے کہ قومیت کی فکر عالم اسلامی پر تھوپی گئی اور وہ ہمارے ذہن ودماغ اور دلوں میں سرایت کر چکی ہے، اور حالت یہ ہے کہ ہم تحریک اسلامی کے جھنڈے کے نیچے بھی اپنے قومی امتیازات کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس طور پر کہ ہر تحریک کی حدود وہیں تک ہوتی ہیں، جہاں تک اس کی قومیت کی حدود ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی سیمنٹ یا کہیے کہ اسلامی اخوت کے حق میں اس قومی عنصر کو پگھلا دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے تمام مسائل کو تنہا اسلامی نظر سے دیکھا جائے اور وہ ہر اسلام پسند کی توجہ کا مرکز قرار پائیں، یہی اسلام کا فرمان ہے اور ہمارے ساتھ مغرب کے تعامل کی یہی بنیاد ہے: '' إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير ''۔

۳۔ **تحریک اسلامی کی داخلی مشکلات:** فکری جمود کی وجہ سے خود بہت سی مشکلات تحریک اسلامی کے داخل میں ہیں، ان میں سے ایک اہم مسئلہ تکثیریت کا ہے، جسے تحریک اسلامی میں پوری طرح قبول کرنا بڑا دشوار ہے۔ ایک جماعت دوسری جماعت کو قبول کرنے کے لئے مکمل تیار نہیں، اور ایک کی طرف سے دوسری جماعت کے لیے پریشانیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ اس ردوتکرار اور عدم برداشت کا خلفیہ دراصل یہ ہے کہ جماعت کے ڈھانچے اور امت کے ڈھانچے میں جسے ''الجماعۃ'' کہا گیا ہے، تمیز نہیں کی جاتی، چنانچہ ہر جماعت خود کو اس ''الجماعۃ'' کا مصداق قرار دیتی ہے جس کی طرف نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا تھا: ''علیکم بالجماعۃ''، حالانکہ اس حدیث میں جماعت سے امت مسلمہ بحیثیت مجموعی مراد تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ فکری وثقافتی تکثیریت قبول کرنے کی فکر کو راسخ کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کی تفسیریں متعدد ہیں، اور نئی تفسیر کے لیے پورا میدان کھلا ہوا ہے، حتی کہ اس کی قراءتیں بھی سات یا دس ہیں، وہ بھی تعدد کو ثابت کرتی ہیں، اس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے وحدت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تکثیریت کی فکر کا حامل ہے۔

۴۔ **وہمی مشکلات:** چونکہ تکثیریت ابھی ہمارے موجودہ فکری زاویے میں راسخ نہیں ہوئی ہے، اس کی وجہ سے بعض اسلام پسندوں نے چند وہمی مشکلات پیدا کر لی ہیں، جیسے اسلام اور جمہوریت کے درمیان تعلق۔ حالانکہ جمہوریت ایک نظام کے طور پر موجودہ دور کا سب سے بہترین

ذریعۂ حکومت اور قیمتی ہدیہ ہے، اور اس میں شورائیت کی تطبیق بھی کسی حد تک ہوجاتی ہے۔ اب آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آج اسلامی تحریک کا وجود کہاں ہے؟ تو سن لیجیے کہ اسلامی تحریک کا وجود وہیں ہے جہاں کسی حد تک جمہوریت قائم ہے، گرچہ وہ مغربی لبرلزم کی شکل میں ہو یا بہت محدود پیمانے پر ہی ہو۔

۵۔ عورت کا مسئلہ اور تحریک اسلامی: یہاں ایک مصیبت اور ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک عورت کے ساتھ تعامل میں کیا رویہ اپناتی ہے۔ عورت معاشرے کا آدھا حصہ ہے اور بقیہ آدھے حصے کی تربیت بھی وہی کرتی ہے۔ لہذا جس قدر معاشرے میں اور اصلاح وتبدیلی کی اس کارروائی میں عورت کا مقام وکردار ہوگا، اسی حساب سے یہ کوشش آگے ترقی کرے گی؛ لیکن ابھی تک بہت سے اسلام پسند اسی جھگڑے میں پڑے ہیں کہ کیا عورت الیکشن میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ عورت کسی الیکشن میں نمائندے کی حیثیت سے شریک نہیں ہوسکتی، بعض کا کہنا ہے کہ وہ ووٹ تو ڈال سکتی ہے، مگر اسے قیادت کی طرف نہیں جھانکنا چاہیے۔ یہ پرانے جھگڑے جب تک باقی رہیں گے، اصلاح وتبدیلی کا عمل مؤخر ہوتا جائے گا، اور یہ اس وقت تک اپنی مطلوبہ رفتار سے ترقی نہیں کرسکے گا، جب تک ہمارے پاس بھی کچھ اسلام پسند عورتوں کی قیادت نہ ہو، اور عورت کو شوری کی مجلسوں میں شریک نہ کیا جائے، اور اسے طلبہ یونین اور دیگر تحریکوں میں بطور ممبر شریک نہ کیا جائے، اور اسے معاسرے کے ہر غم اور سرگرمی میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے شامل نہ کیا جائے۔

۶۔ فنون لطیفہ کے تعلق سے تحریک اسلامی کا رویہ:

یہ آخری رکاوٹ ہے کہ تحریک اسلامی فنون لطیفہ (آرٹ) کے ساتھ کیسا رویہ اپناتی ہے۔ فنون لطیفہ سے مراد اس کائنات کے خوبصورت مظاہر ہیں۔ یہ بات اس لیے ہے کہ یہ فنون بڑی حد تک مغربی فساد کے مظاہر میں ملوث ہوچکے ہیں، ان میں اب شفافیت باقی نہیں رہی ہے، اس لیے مسلمان ان سے کتراتے ہیں، خواہ شعروشاعری ہو، ناول ہو، ڈرامہ ہو، موسیقی ہو یا دیگر فنون لطیفہ.....حالانکہ یہ چیزیں بڑی مؤثر ہوتی ہیں اور دلوں میں چپکے سے گھس جاتی ہیں۔ ان فنون سے یہ بے اعتنائی ان مسلمانوں کے ذہنوں میں زیادہ ہے، جو اس حقیقت کو بھلا چکے ہیں کہ قرآن کریم محض قانون وفلسفے اور تربیت کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب کا شاہکار اور خوبصورت فن کی بے نظیر نشانی بھی ہے، اور اس کا معجزاتی پہلو - بطور خاص - اس کی خوبصورت نص میں ہے، جو نظم کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس امت کو جس کا معجزہ جمالی نوعیت کا ہو، یہی زیب دیتا ہے کہ وہ تمام فنون میں کمال پیدا کرنے میں سبقت کرے۔ اور اسی لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عظیم علماء اسلام شاعر اور ادیب بھی تھے۔

آخر میں پھر تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات بہت اہم ہے کہ ہمارا بھروسہ اللہ کی ذات پر برقرار رہے، اور ہمیں اسلامی تحریک کی کامیابی کا پورا یقین ہو۔ سرکشی کی ان موجوں کا سامنا کرنے کے لیے ہمارے پاس دو سرمایے ہیں:

- نماز، ذکر، تلاوت اور دیگر طاعات کے ذریعے اللہ تعالی سے تعلق کو مضبوط کرنا۔
- جماعت (اجتماعیت) کی جڑوں کو مضبوط کرنا اور منظم اجتماعی عمل میں شامل ہونا۔

یہی مطلب ہے اس آیت کا: ''واعتصموا بحبل الله جميعاً ولاتفرقوا''۔

☆☆☆

❑ تجزیہ

ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ-اہمیت اور تقاضے

بھارت کی موجودہ صورتحال سمجھنے کے لیے تاریخ سے رجوع ہونے کی ضرورت

شبیع الزماں، پونے

برِصغیر ہند و پاک کی تاریخ کا مطالعہ ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہا ہے؛ لیکن موجودہ حالات میں اس کی معنویت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بھارت کی موجودہ سیاسی صورتحال اس بات کا شدید تقاضا کرتی ہے کہ ہم ماضی میں جھانک کر برصغیر کے گزرے ہوئے حالات کا جائزہ لیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہاں کیا ہوگزرا ہے۔تاریخ بعض اوقات زنجیر پا ہو جاتی ہے۔ بھارتی سماج پر اس کی تاریخ نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تاریخ بار بار ماضی سے نکل کر حال میں آجاتی ہے اور ہر بار نئی بحثوں کو جنم دیتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔عمر چھاپرا اپنی کتاب مسلم تہذیب میں تاریخ کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔''یہ بات واضح رہے کہ مستقبل، ماضی سے اتنا گہرا مربوط ہے کہ جب تک ہم زوال کی ان قوتوں کی اچھی طرح شناخت نہ کرلیں اور یہ نہ جان لیں کہ وہ کس طرح متحرک ہوئیں اور آپس میں مل کر زوال کی رفتار میں اضافہ کا باعث بنیں، ہم عالم اسلام کی ترقی اور اس کے تیز رفتار عروج کے لیے مناسب طریقہ کار اور حکمت عملی تجویز نہ کرسکیں گے۔''(مسلم تہذیب)۔

بھارت کی تاریخ کے مطالعے کے یوں تو کئی اسباب ہوسکتے ہیں؛لیکن حالات حاضرہ کی مناسبت سے ذیل میں چند وجوہات درج کی جارہی ہیں:

اول: بھارتی سیاست میں موجودہ تمام حصے داروں جیسے، برہمن، دلت، عیسائی اور مسلمان تاریخ ہی سے ابھرے ہیں۔اگر ہم بھارت کی چار ہزار سالہ تاریخ کے ارتقا کا جائزہ لیں گے تو اس پورے وقفہ میں چار تاریخی ادوار بہت واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ چار مختلف مذاہب یا تہذیبیں اپنے اپنے دور میں بھارت کی تقدیر کی مالک تھیں۔ ویدک آرین، بدھسٹ ،مسلمان اور انگریز (عیسائی)۔ان میں سے ہر ایک گروہ نے بھارت کی تاریخ میں اہم اضافے کیے ہیں۔اس تاریخ سے ابھرنے والا ہر گروہ آج بھی بھارتی سیاست اور سماج میں اہم رول ادا کررہا ہے۔اگر ہر گروہ کی سیاست، معاشرت اور قومی عزائم کا جائزہ لیا جائے تو ان کی جڑیں تاریخ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ بھارتی سیاست کو سمجھنے کے

لیے، یہاں موجود سماج کے سبھی حصہ داروں کو ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔

دوم: سیاست اپنے کمالات دکھانے میں مذہب، زبان، قوم، نیشنلزم، کلچر، ذات، طبقات، تہذیب، شخصیات وغیرہ جیسے جن اجزاء کا استعمال کرتی ہے، وہ تمام اجزاء برِصغیر کی اس سیاست میں ہمیں بدرجہ کمال نظر آتے ہیں۔ان تمام اجزائے سیاسی کی نشوونما تاریخ کے مختلف مراحل میں ہوئی ہے۔ چناں چہ ان اجزاء کو سمجھنے کے لیے بھارت کی تاریخ کا فہم ضروری ہے۔

سوم: بھارت کے سلگتے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ اسلاموفوبیا یا مسلمانوں کے خلاف نفرت ہے، اسلاموفوبیا کے لیے استعمال ہونے والے بیانیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی تمام تر بنیادیں تاریخی حوالوں پر ہی رکھی ہوئی ہیں۔اسلاموفوبیا کے بیانیوں کو سمجھنے اور ان کا جواب دینے کے لیے اس تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے جن میں یہ تمام بیانیے تشکیل پائے ہیں۔

چہارم: ہندوتوا موجودہ بھارت کی غالب فکر ہے، بھارتی سیاست میں اسے مکمل تسلط حاصل ہے۔ ہندوتوا کے اس نظریہ کی اٹھان ہی مسلم مخالف تاریخ کی بنا پر ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کو بالکل ہی ہندو مخالف تاریخ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بابر، اورنگ زیب، خلجی و دیگر مغل بادشاہوں اور مسلم حکمرانوں کے دور کو ہندوؤں پر مظالم کے دور کے طور پر پیش کیا گیا جن کے خلاف شیواجی اور مہارانا پرتاب جیسے حکمرانوں نے ہندوؤں کے لیے آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ ہندوتوادی آج بھی اسی بیانیہ کو استعمال کرتے ہیں کہ موجودہ مسلمان انہی ظالم بادشاہوں کی وراثت ہیں۔ بابر کی اولاد جیسے جملے اس تاریخی بیانیے کو زندہ کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔سٹیزن شپ بل کے حق میں جو وہائٹ پیپر شیاما پرساد مکھرجی ریسرچ فاؤنڈیشن نے جاری کیا تھا اس کی تمام تر بنیادیں تاریخ پر ہی تھیں۔

جدید دور ایک نظریاتی دور ہے۔ یہاں ہر چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک خاص زاویہ ہوتا ہے اور اسی زاویہ نگاہ سے چیزوں کی تعبیر وتشریح کی جاتی ہے۔علم تاریخ بھی اس سے محروم نہیں ہے۔پچھلے کچھ عرصے میں بھارتی تاریخ کو سمجھنے کے لیے چار مکاتب فکر (school of thoughts) قائم ہوئے ہیں۔

۱۔کیمبرج (Cambridge)

۲۔مارکسسٹ (Marxist)

۳۔سبالٹرن (Sabaltern)

۴۔نیشنلسٹ (Nationalist)

ایک پانچواں مکتب فکر، ہندوتوادیوں کی طرف سے بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں بھارتی تاریخ کو پوری طرح مسخ کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

مسلمانوں نے بھارت کی تاریخ میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔سماجی، سیاسی اور ہر سطح پر انہوں نے اثرات ڈالے ہیں؛ لیکن موجودہ تاریخ میں انھیں ایک ویلن کی حیثیت سے ہی پیش کیا جاتا ہے۔مسلمانوں کی تاریخ کا عمومی تصور شمشیر زنی، سرحدوں کی تسخیر اور ملکوں کی فتوحات سے عبارت ہے۔ غیر مسلم تو مسلمانوں کی تاریخ کو اسی زاویہ سے دیکھتے ہیں؛ لیکن خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی تاریخ کے اسی ورژن

سے واقف ہے۔ مسلمانوں کی علمی فتوحات اور مختلف علوم کے فروغ میں ان کی بیش بہا کاوشوں کو عام واقفیت حاصل نہیں ہے۔ اس تاثر کے قیام میں جتنی دوسری تہذیبیں اور قومیں ذمہ دار ہیں اتنے ہی ؛ بلکہ اس سے زیادہ خود مسلمان بھی ذمہ دار ہیں جو اپنی تاریخ میں سائنسدانوں، اسکالرز اور علوم کے ماہرین کی بہ نسبت صرف شمشیر زنوں، فاتحین اور حکمرانوں پر ہی فخر محسوس کرتے ہیں اور ان کے کارناموں کو ہی اپنی تاریخ تصور کرتے رہے ہیں۔ اس لیے تاریخ کے ایک ایسے ورژن کی ضرورت ہے جو نہ صرف مسلم دور حکومت ؛ بلکہ بھارت کی مجموعی تاریخ کا صحیح تصور پیش کر سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''آخری عہد مغلیہ کا بھارت'' میں لکھتے ہیں ''اس وقت ہمارے معاشرے کی ضرورت نہ صرف زوال کے اسباب کو سمجھنے کی ہے ؛ بلکہ اس سے سبق بھی سیکھنے کی ہے۔ تاریخ اگر چہ ماضی کا نام ہے مگر اس کا رشتہ حال سے پیوست ہے۔ اس لیے ہماری ماضی کی تاریخ ہمارے حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔''

مطالعہ تاریخ کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمیں تاریخ سے کیا لینا دینا ہے، ماضی کے کھنڈرات کو حسرت بھری نگاہوں سے تکنے سے کیا حاصل ہوگا، ہمیں مستقبل کی صورت گری کرنی چاہیے، بس آگے بڑھ کر آئندہ کی فکر کرنی ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے ؛ لیکن مستقبل کی فکر کرنے کے لیے ماضی سے قطع تعلق کر لینے کے کیا معنی؟ تاریخ سے رشتے توڑ کر قومیں اس پودے کی مانند ہو جاتی ہیں جس کی زیر زمین جڑیں کاٹ دی گئی ہوں اور زمین کی سطح پر بظاہر خوشنما نظر آنے والا پودا اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے سبب بہت جلد سوکھنے والا ہوتا ہے۔ تاریخ بلا شبہ ماضی کا نام ہے ؛ لیکن اس کا رشتہ حال سے جڑا ہوتا ہے اور مستقبل کی نقشہ بندی کے لیے اس تاریخ کا مطالعہ لازمی ہے۔

بھارت میں چھ سو سال تک مسلمانوں کی مضبوط حکومتیں قائم رہیں ؛ لیکن آج اسی ملک میں وہ اجنبیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کسی دور کا خاتمہ اچانک سے نہیں ہو جاتا ؛ بلکہ اس کے پس منظر میں طویل عرصے تک سیاسی، سماجی اور معاشی وجوہات کام کر رہی ہوتی ہیں اور پھر اچانک ایک حادثہ اس کھوکھلی عمارت کو زمین بوس کر دیتا ہے۔ تاریخ میں کسی دور کے خاتمے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان واقعات کا مطالعہ کیا جائے۔ ہر دور اپنے پہلے والے دور کی پیدائش ہوتا ہے، اس لیے آج کے زوال کو سمجھنے کے لیے کل کی تاریخ جاننا ضروری ہے۔ اٹھارویں صدی کو صرف اٹھارویں صدی کے مطالعے سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے ؛ بلکہ اس کے لیے سترہویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں کا جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح اکیسوی صدی کو صرف آج کے احوال سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے ؛ بلکہ اس ماضی کو سمجھنا ہوگا جس کے بطن سے اکیسویں صدی نے جنم لیا ہے۔ چنانچہ اگر ہم بھارت کی موجودہ صورتحال کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے تاریخ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

(بشکریہ ہفت روزہ دعوت، ۱۰ نومبر ۲۰۲۱ء)

☆☆☆

❑ سوانحی مطالعہ

(آخری قسط)

آپ بیتی شیخ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ

ترجمہ وتلخیص: مولانا طلحہ نعمت ندوی

میری تدریس کا آغاز سب سے پہلے میرے استاد شیخ حبیب اللہ شنقیطی (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) کے زمانہ میں ہوا، جب کبھی ان کا سفر ہوتا تو طلبہ کو پڑھانے کے لئے مجھے اپنا قائم مقام بنا کر جاتے، اور لوگوں سے کہا کرتے کہ جتنا علم مجھے ہے اتنا ہی؛ بلکہ اس سے زیادہ اس نوجوان کو بھی ہے، یہ ان کا حسن ظن تھا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجھے ایسا ہی بنادے۔ جنوبی جزائر کے علاقہ اربواث کے مضافات کے ایک گورنر حاجی احمد آشن آغا تھے، انہوں نے ہمارے استاد سے درخواست کی کہ مجھے ان کی تدریس کے لئے بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ اس درس میں خود شریک ہوتے تھے، اور ان کے بیٹے القائد البشیر بھی، اور ان دونوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ شرکت کرتے۔ یہاں میں دو سال رہا، اس کے بعد میرے استاد کی وفات ہوگئی تو میں نے وجدہ اور فاس کا سفر کیا، وہاں کے ایک ممتاز عالم وادیب شیخ احمد سکیرج نے اپنے بیٹے اور بھتیجے کو کچھ عربی ادب کے اسباق پڑھانے کی گذارش کی، چنانچہ میں نے ان دونوں کو مکمل ایک سال پڑھایا، اور پھر انہوں نے ہی مشرق کے سفر کا پاسپورٹ حاصل کرنے میں میری مدد کی، فرانسیسی سامراجی حکومت صرف اسی شخص کو پاسپورٹ دینے کی اجازت دیتی تھی جس کو وہ جانتی ہو، اور وہ شخص حکومت کا مخلص ہو، اور اس کی نگاہ میں قابل اعتماد ہو، خاص طور سے تعلیم یافتہ نوجوان کے سلسلہ میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی، چنانچہ انہوں نے فرانسیسی سفیر کو خط لکھا کہ لکھا کہ محمد تقی سلمہ میری نگاہ میں میرے بیٹے عبدالکریم ہی کی طرح ہیں، وہ فرانسیسی حکومت سے تعلق ومحبت رکھتے ہیں اور میں ان کی ضمانت لیتا ہوں، یہ جناب والا کا میرے ساتھ خاص کرم تھا ورنہ وہ جانتے تھے کہ میرے خیالات اس کے بالکل برعکس تھے، چنانچہ میں ان کے ساتھ مکمل ایک مہینہ تک فرانسیسی انکوائری آفس اور سفارت خانہ کا چکر لگاتا رہا۔ بالآخر نگران اعلی سے جس کا نام انبروزنی تھا گفت وشنید اور بات چیت کا موقع ملا، وہ عربی سے واقف تھا، اس نے پوچھا، مصر میں کوئی تم سے واقف ہے؟ میں نے جواب دیا کوئی نہیں، لیکن شیخ احمد سکیرج نے قاہرہ کے فرانسیسی سفیر کے نام جو ان کا دوست تھا میری سفارش کا خط لکھ دیا، سفیر نے مجھ سے خط مانگا، اور پڑھ کر فون اٹھایا اور پاسپورٹ آفیسر کو آرڈر کردیا کہ مجھے پرمٹ دے دیا جائے، اور پھر انہیں اس کی اطلاع دے دی، پھر مجھ سے کہنے لگا، دیکھو، مصر میں بہت سے فتنوں سے تمہیں واسطہ پڑے گا، لیکن، میری نصیحت ہے کہ جو علم حاصل کرنے تم وہاں جارہے ہو اسی میں لگے رہنا، اور سیاسی مشاغل اور لوگوں سے

زیادہ ملنے جلنے سے پرہیز کرنا،اس پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پاسپورٹ حاصل کرلیا۔

اس کے بعد میں رخت سفر باندھ کر مصر روانہ ہوگیا،وہاں میرا قیام تقریباً ایک سال رہا،سال کے آغاز ہی میں شیخ عبدالظاہر ابوالسمح نے مجھے بلایا،جو بعد میں مسجد حرام کے منصب امامت وخطابت پر فائز ہوئے،اس وقت وہ مسجد الاسطی ابوہاشم المہندس کے امام تھے،وہاں نماز بھی پڑھاتے تھے اور وعظ بھی کہتے تھے اور درس بھی دیتے،، یہ سلفیوں کی مسجد تھی جن کو وہابی بھی کہا جاتا ہے،انہوں نے مجھے وہاں نماز پڑھانے کے لئے مدعو کیا،اور کہا کہ وہاں رہ کر میں درس بھی دوں،اس لئے کہ فقہاء کا پورا گروہ جن میں مساجد کے ائمہ ومؤذنین بھی شامل تھے شیخ سے اکثر مناظرہ کرتے رہتے تھے، ایک دن انہوں نے شیخ کو مناظرہ کی دعوت دی اور ایک شخص کو تیار کرلیا کہ جب شیخ آجائیں تو ان لوگوں کا اشارہ پاکر وہ ان کو پیٹنا شروع کردے،مناظرہ شروع ہوا تو ان لوگوں نے اس شخص کو اشارہ کیا اور وہ ان کا اشارہ پاکر شیخ پر ٹوٹ پڑا،انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حاکم اسکندریہ کے پاس مقدمہ درج کروادیا کہ عبدالظاہر ابوالسمح ایک جاہل اور گمراہ وہابی ہے جس کا یہ کہنا ہے عیسی ابن مریم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر ہے،اور آپ سے توسل واستغاثہ کو ناجائز قرار دیتا ہے،اور مسالک فقہیہ اربعہ پر طنز اور طعن وتشنیع کرتا ہے،لوگوں میں پانچواں مسلک پھیلا رہا ہے،وہ ایک مسجد میں خطبہ دینے کے لئے ممبر پر چڑھا تو اس کے دونوں جانب نصب جھنڈے کو زمین پر گرا کر دینی شعار کی بے حرمتی کی،مزید یہ کہ اس نے رمل الاسکندریہ میں بڑا فتنہ برپا کردیا ہے جس کے نتیجہ میں باپ بیٹے کے درمیان،بھائی بھائی کے درمیان،رشتہ داروں کے درمیان دوری ہوگئی،لہذا آپ سے یہی گذارش ہے کہ اس فتنہ کا سد باب کیا جائے،اور تمام مساجد میں اس کی امامت اور تدریس پر پابندی عائد کردی جائے،اور وہ مسجد جسے اس کے ایک متبع ومرید نے بنایا تھا اس میں تالا لگادیا جائے۔

میں اس وقت میں ایک مراکشی کے پاس مقیم تھا اس نے قاصد دوڑایا کہ جیسے ہی خبر تم بلا کسی تاخیر جلد چلے آؤ،کیوں کہ حاکم شہر کے پاس مسجد ابوالہاشم کو بند کرنے کی درخواست دی گئی ہے،اور شیخ عبدالظاہر کو حکم ہوا ہے کہ نہ وہ امامت کریں گے نہ کسی مسجد میں درس دیں گے۔میں جب شیخ کے پاس حاضر ہوا تو شیخ نے مجھ کو حکم دیا کہ میں مسجد کا تالا کھول کر جمعہ اور نماز پنجگانہ کی امامت کروں اور درس بھی دوں،تا آں کہ اس صورت حال کے ازالہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سبیل پیدا ہوجائے،چنانچہ میں نے مسجد کھول کر نماز پڑھانی شروع کردی اور درس بھی دینے لگا،لیکن مولویوں کو یہ بھی گوارا نہ ہوا،چنانچہ انہوں نے ملک فؤاد کو اسی مضمون کا خط لکھا جو انہوں نے حاکم شہر کو بھیجا تھا،مزید اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے عزت مآب حاکم کے پاس ان تمام باتوں کا ثبوت ہے،چنانچہ انہوں اس کو امامت وتدریس سے روک دیا تھا اور مسجد میں تالا لگانے کا آرڈر کردیا تھا،اب اس نے ایک مراکشی کو بلایا ہے جس کا نام محمد تقی ہلالی ہے،اسے فرانسیسی حکومت کی حمایت حاصل ہے،وہ اپنے افکار وخیالات کی اشاعت کررہا ہے،نئی نئی باتیں کرتا ہے،اور انہیں فاسد عقائد وخیالات کی دعوت دیتا ہے جو ابوالسمح کے عقائد تھے،لہذا جناب والا سے گذارش ہے کہ اس مراکشی کو مسلمانوں کے عقائد بگاڑنے سے روکیں،لیکن ان کی یہ سازش ناکام ہوگئی،ملک فؤاد نے یہ خط حاکم اسکندریہ کے پاس بھیج دیا،وہ دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگیا ،اس کی ناراضگی کے دو اسباب تھے،ایک یہ کہ ان لوگوں نے اسے براہ راست بادشاہ کو کیوں شکایت لکھی،اسے کیوں نظر انداز کیا۔اس کی ناراضگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر مجھے نماز سے روک دیا جائے گا تو فرانسیسی سفیر کو اس میں مداخلت کا

موقع ملے گا،اوراس وقت مصر میں اہل یورپ کو کچھ اختیارات دئے گئے تھے، یہ ۱۳۱۴ھ کا واقعہ ہے ، چنانچہ انہوں نے تمام دستخط کرنے والوں کو یکے بعد دیگرے اپنے پاس بلایا ،جس کا دستخط سب سے پہلے تھا اس سے پوچھا کیا یہ تمہاری تحریر ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں اسی کی تحریر ہے، پھراس سے دوسری مرتبہ کہا کہ کیا آپ اقرار کرتے ہیں کہ یہ آپ کا دستخط ہے،ان کے اقرار پراس نے حکم نافذ کیا کہ ان کوابھی روک کر رکھو، پھر دوسرے،تیسرے اوراسی طرح اخیر تک بلاتے رہےاور پوچھ گچھ کرتے رہے، پھر سب کو جمع کیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا ،تم لوگوں نے میرے رہتے ہوئے بادشاہ کو کیوں خط لکھا ،تم اس سے پہلے بھی میرے پاس آئے تھےاور شکایت کی تھی کہ ابوالسمح وہابی ہے،مفسد ہے ،وغیرہ وغیرہ، میں بھی سمجھا کہ تم سچ بول رہے ہو،اور میں ان کوروک دیا تھااور مسجد بند کرنے کا حکم نافذ کردیا تھا،اب اس مراکشی کا کیا معاملہ ہے،کیا یہ بھی وہابی اور فتنہ پرور ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا جی حضور یہ بھی بالکل اسی کی طرح ہے۔ پھران سے کہا کہ جوخط تم نے بادشاہ کے پاس بھیجا ہےاس میں لکھا ہے کہ تمہیں اس سے فتنہ کا خطرہ محسوس ہورہاہے،اگر یہ مراکشی وہابی یہاں رہ گیا تو کشت وخون ہوگا ،یہ وہابی عقیدہ پھیلاتا رہتا ہے،کیا تمہیں لوگ ملک کے امن کے ٹھیکہ دار ہو،کیا تم سے اس سلسلہ میں باز پرس ہوگی اور حکومت کی طرف سے گرفت ہوگی کہ تم نے ملک وعلاقہ کے امن وسلامتی کا تحفظ کیوں نہیں کیا؟اس فتنہ کوفرو کرنے کی ذمہ داری تمہارے ہی سر ہے؟ بلکہ تم ہی لوگ تمام فتنہ وفساد کی جڑ ہو،اسکندریہ میں اگرعقائد کے سلسلہ میں کوئی فتنہ ہوا تو تمہاری ہی گردن پکڑی جائے گی،اورسزا ملے گی،تم تو ابھی ہی سزا کے مستحق ہولیکن ابھی میں چھوڑ دیتا ہوں ۔ چنانچہ وہ ناکام واپس ہوئے اورایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔

اس کے بعد شیخ عبدالظاہر جمعہ کی نماز میں چھپ چھپ کر آنے لگے،جب دو ماہ گذر گئے اور ماحول خراب کرنے والا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا تو وہ علانیہ تشریف لانے لگے ،اور مجھے بھی اطمینان ہوا کہ دشمنوں کی مخالفتوں میں کچھ کمی آئی،اوران کی ہمتیں اب پست ہوگئی ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے حضرت سے قاہرہ واپسی کی اجازت چاہی اور وہاں پہنچ گیا، پھر وہاں سے صعید کا سفر کیا۔گذر چکا کہ چند ماہ مقام ریمون میں قیام کرکے توحید واتباع کتاب وسنت کی دعوت دیتا رہا،میری دعوت پر جب شہر کے ذمہ دار عالم نے میری بات قبول کرلی تو چندلوگوں کوچھوڑ کر پوراشہراسی مسلک پر چل پڑا۔

مزید ایک بات یہ بھی کہہ دوں کہ شیخ یوسف نے میری دعوت قبول کرنے کے بعد مجھ سے شہر کی سب سے بڑی مسجد میں درس دینے کی گذارش کی ،شہر کی تمام مساجد میں سلفیوں کا داخلہ ممنوع تھا،اللہ تعالی نے اسب کومیری دعوت کی بنا پر یکجا کردیا ،اس پر شہر کے پیر صاحب اور امیرشہرمرفوت کو بہت غصہ آیا ،انہوں نے جامع ازہر سے ایک بہت ہی قابل استاد کومناظرہ کے لئے بلایا،امیرشہر کے بالاخانہ میں مجلس مناظرہ کا انعقاد طے ہوا، پیرصاحب اوران کے خدام نے پورے شہر میں یہ تشہیر کروادی کہ ازہری عالم اس مراکشی مولوی سے مناظرہ کریں گے،اوراس کو شکست دے کر رسوا کردیں گے،اوراس کی دعوت پر پانی پھیر دیں گے ،وہ ازہر کا تعلیم یافتہ نہیں ، بلکہ جاہل آدمی ہے، ہمارے بزرگ شہران کے دام فریب میں پھنس کراس کی تعظیم کرنے لگے ہیں ۔انہوں نے یہ بات اس لئے کہی تاکہ میں ان سے مناظرہ پرآمادہ ہوجاؤں ،جس نے مجھے یہ بات آکر بتائی میں نے اس کو جواب دیا کہ امیرشہر نے بالکل سچ کہا ، میں بالکل جاہل ہوں، ازہر کا پڑھا ہوانہیں ہوں،میری حج کی نیت ہے اگرآسانی سے ممکن ہوتو چلا جاؤں گا،لیکن میں جن مسائل کی طرف لوگوں کی وعوت دے رہا ہوں یعنی توحیداور

اتباع سنت اس سلسلہ میں بصیرت رکھتا ہوں ،اور میرے پاس دلائل بھی ہیں ،اگر شیخ الازہر اور تمام اساتذہ بھی آجائیں تو کوئی میری ایک دلیل کا بھی جواب نہیں دے سکتے۔میرے سلفی بھائی مجھ سے کہنے لگے کہ اس طرح کی باتیں مت کہئے ،اس سے ان کی حرص بڑھے گی ،ازہری عالم سے مناظرہ کے لئے میدان میں آیئے ،ازہریوں کے پاس دلائل نہیں ہیں ،وہ کتاب وسنت سے واقفیت نہیں رکھتے ،ہم اپنی کم علمی کے باوجود ان سے مناظرہ کرکے ان کو لاجواب کرسکتے ہیں،لیکن میں نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ آپ لوگوں کی اپنی رائے ہے میری رائے اس سے الگ ہے، میں کسی سے مناظرہ نہیں کروں گا، ہاں اگر کوئی ازخود مجھ پر حملہ آور ہوجائے تو پھر مناظرہ کرنا میری مجبوری ہوگی۔اور میرا اپنا اصول یہ ہے کہ حتی الامکان مناظرہ سے بچاجائے، جو میری مخالفت کرتا ہے اس سے میں کہتا ہوں کہ تم بھی کسان ، میں بھی کسان ،اللہ کی زمین بہت کشادہ ہے ،تم زمین کے ایک حصہ پر کھیتی کرو میں دوسری زمین پر کھیتی کرتا ہوں ، پیداوار اللہ کے قبضہ میں ہے،اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے اعتقاد کے مطابق دعوت دیتا ہوں ،تم اپنے اعتقاد کے مطابق لوگوں کو دعوت دو، جو میری دعوت قبول کرے وہ میرا ہے، جو تمہاری دعوت قبول کرے وہ تمہارا ہے،ہمیں لڑائی جھگڑے سے کوئی مطلب نہیں ۔جب امیر شہر اور ازہری مولوی کو اس کی اطلاع ملی تو ان کی حرص مناظرہ اور بڑھ گئی ،اور انہوں نے سمجھا کہ میں بالکل کمزور ہوں ۔ پھر ازہری مولوی نے امیر شہر کے اشارہ سے یہ ارادہ کیا کہ جس وقت میں جامع مسجد میں درس دوں اس وقت وہ مجھے آکر گھیر لے ،اس پر بھائی یوسف نے ایک قاصد کو ان کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم نے اس مراکشی عالم کا انتخاب کیا ہے،اس سے پہلے ہم ان سے مشکل سولات کے جوابات حاصل کرکے ان کی قابلیت سے مطمئن ہوچکے تھے ،مسجد لڑائی جھگڑے اور بحث ومباحثہ کی جگہ نہیں ہے،قسم بخدا اگر آپ نے اس مراکشی عالم وشیخ کے سامنے اعتراض کا ایک جملہ بھی کہا تو میں سپاہیوں سے کہوں گا کہ وہ ان کے ساتھ اسٹیشن جائیں اور ان کو ٹرین پر بٹھا کر آئیں،مرفوت اور ازہری مولوی دونوں ان کے اس جواب سے حیرت میں پڑ گئے اور بہت پریشان ہوئے ،ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

ایک دن رمضان میں حاکم شہر کے یہاں میں افطار پر مدعو تھا، حالاں کہ وہ بے دین اور ملحد تھا لیکن مجھ سے کہنے لگا نہ میں نہ ان کے ساتھ ہوں ،نہ آپ کے ساتھ لیکن آپ کے عقائد کو ان کے عقائد کے مقابلہ میں عقل کے زیادہ قریب سمجھتا ہوں۔جب میں افطار کے بعد اس حاکم شہر کے محل کے پاس سے گذر کر واپس جانے لگا تو اچانک پیر صاحب ملے اور سلام ومصافحہ کرکے کہنے لگے کہ عزت مآب حاکم شہر آپ کو قہوہ پینے کے لئے بلا رہے ہیں ، میں نے کہا تراویح کے بعد میرا درس ہوتا ہے ،انہوں نے کہا صرف پانچ منٹ، پھر وہ محل کے اندر گئے ،وہاں مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرہ میں گئے جہاں ازہری مولوی صاحب تنہا بیٹھے ہوئے ملے،ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے مجھ پر سولات کی بوچھار شروع کردی،اور میں ان کے جواب دیتا رہا،اس طرح جس مناظرہ کا انہیں شوق تھا وہ پورا ہوگیا،لوگوں نے جب اس کا ذکر سنا تو تراویح چھوڑ کر وہاں جمع ہوگئے ،اچانک میں نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو وہاں تو صرف جبہ ودستار اور لمبی لمبی ٹوپیاں ہی نظر آرہی تھیں ،جن سے پورا میدان بھرا تھا،لوگ اس کے فرش پر بیٹھے تھے ،اتنے میں ازہری صاحب بلند آواز سے کہنے لگے اشهد بالله ان هذا الرجل عالم وانا راجع عما قلته ،اشهد بهذا ان كنت اخالفه فى بعض المسائل ،یہ سن کر امیر شہر اور پیر صاحب دونوں مبہوت رہ گئے ،مرفوت صاحب کہنے لگے کہ

حضرت میں چاہتا ہوں کہ یہ مناظرہ دوسرے وقت میں کرلیں ،ابھی میں نے مراکشی صاحب کو مناظرہ کے لئے نہیں بلکہ قہوہ پینے کے لئے بلایا ہے،الحمدللہ اس طرح یہ مناظرہ اہل حق کے حق میں اختتام کو پہنچا،اور امیر شہر مرفوت نے جو کچھ درہم میسر ہوسکے ازہری صاحب کو دے کر ان کو رخصت کیا۔

سنت وبدعت کی جب بات نکلی ہے تو ایک اور دلچسپ اسی مناسبت سے واقعہ بیان کرہی دوں جو شیخ یوسف نے ہندوستان سے واپسی کے بعد ۱۳۴۵ھ میں ریرمون کے سفر میں مجھ سے بیان کیا ،انہوں نے بتایا کہ جب وہاں کے سارے لوگ سنت پر چلنے لگے اور تمام بدعات ترک کردی تو لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ باشندگان ریرمون نے اپنا دین بدل لیا ہے،رفتہ رفتہ یہ خبر قاہرہ یا اسیوط کے وزارۃ الاوقاف تک پہنچی، چنانچہ اس اطلاع کے فوراً بعد وزارۃ الاوقاف سے انسپکٹر آ گیا،اور شیخ یوسف سے بات کر کے کہنے لگا،ہم نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے اپنا دین بدل دیا ہے اور تمام مسجدوں میں جمعہ اور غیر جمعہ میں جو اعمال ہوتے ہیں اس کے کی مخالفت کرتے ہو،انہوں نے کہا،آپ عالم ہیں،ہم لوگ جاہل،آپ ہمارے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھیے، جو کمی نظر آئے اور خلاف سنت عمل معلوم ہو،اس کی طرف توجہ دلایئے ہم اس کو چھوڑ دیں گے،اور خلاف سنت دیکھیں یا سنت میں کمی اس پر متنبہ کریں،ہم اس پر عمل کریں گے،وہ کہنے لگا،شیخ یوسف! سنت سر آنکھوں پر لیکن لوگ ایک طویل زمانہ سے کچھ بدعت مستحسنہ پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں، بدعت کے بھی اسی طرح پانچ احکام ہیں،وہ بھی واجب،مستحب،مکروہ ،مباح اور حرام ہوتی ہے جیسا کہ بہت سے اہل علم نے صراحت کی ہے،ہم ان بدعات کو بالکل باطل نہیں قرار دے سکتے،لوگ اس سے مانوس ہیں،زمانہ سے ان پر عمل ہورہا ہے،اور علماء نے اپنی خاموشی سے اس پر مہر تایید ثبت کردی ہے، میں نے ان سے کہا پھر آپ کیا چاہتے ہیں ،ہم سنت چھوڑ کر بدعت اختیار کرلیں ،؟ایسا تو ہم سے ہونہیں سکتا! پھر انسپکٹر کہنے لگا،آپ کو معلوم ہے کہ یہ مسجد اوقاف کی ہے،اسی کی تعمیر کردہ ہے اور مصارف بھی وہی برداشت کررہی ہے،انہوں نے جواب دیا کہ ہم صرف سات دن میں اس سے اچھی مسجد بنا سکتے ہیں، پھر یہ مسجد خالی کردیں گے،امام وموذن صاحب مل اکیلے اس میں نماز پڑھتے رہیں!وہ کہنے لگا ،ایسا کام کیوں نہ کرلیں جس سے ہماری اور آپ کی رائے دونوں پر عمل ہوجائے،میں عرض کیا ،بتایئے،اس نے کہا ،میں تمہارے ساتھ جمعہ پڑھوں،اس جمعہ میں وہ سب بدعت انجام دو جو ہوتا رہا ہے ،پھر میں آفس جا کر بتادوں گا کہ تمہارے بارے میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے غلط ہے،اس کے بعد پھر ان بدعات کو چھوڑ دینا اور سنت کے مطابق عمل کرتے رہنا،میں نے اس سے کہا ہاں ایسا ہوسکتا ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا،اس کے بعد پھر سنت کے مطابق عمل ہونے لگا۔

اس کے بعد میں نے نواب صدرالدین کی طلب وفرمائش پر چھ مہینے تک دہلی میں علی خاں کے مدرسہ میں دیوان متنبّی پڑھائی ، پھر شیخ عبدالمجید حریری نے مجھے بنارس بلوایا جو ہندوؤں کی نگاہ میں بڑا مقدس ہے، مجھے وہاں ادب اور تجوید کی تدریس کے لئے بلایا گیا تھا، چنانچہ وہاں تین ماہ قیام رہا،انہی ایام میں مشہور شاعر وادیب شیخ عبدالحمید فراہی بھی نے اپنے علاقہ کے ایک مدرسہ میں تدریس کی دعوت دی،لیکن میں نے شیخ حریری کی دعوت کو ترجیح دی ،اور اس مدرسہ میں جس کو شیخ مصطفیٰ آل ابراہیم نے میرے ہی لئے قائم کیا تھا ایک سال درس دیا، پھر میں ۱۳۴۵ھ میں سعودی عرب چلا گیا ، وہاں دو سال تک مسجد نبوی میں تدریسی خدمت کے ساتھ مدرسین کا نگراں بھی رہا، وہاں سے مسجد حرام اور معہد سعودی منتقل ہوگیا،ان دونوں اداروں میں نے ایک سال تک تدریسی خدمت انجام دی،اس کے بعد شیخ سلیمان ندوی نے ندوہ آنے

کی درخواست کی ،اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے،ندوہ العلماء کے دوران قیام شیخ سلیمان ندوی نے مجھے ایک مجلّہ جاری کرنے کا حکم فرمایا تا کہ طلبہ کی عربی تحریر کی مشق ہو سکے، چنانچہ میں نے اپنے سب سے لائق شاگرد مسعود عالم ندوی کے تعاون سے ایک رسالہ نکالا اور اس کا نام الضیاء رکھا ، یہ مجلّہ جلد ہی ہندوستان میں پھیل گیا ،اور لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ،اس کے ساتھ میں ہفتہ میں دومرتبہ تقریر کی مشق بھی کرواتا، ہر باصلاحیت طالب علم کوئی موضوع منتخب کر کے اس پر ایک تقریر تیار کرتا اور طلبہ کے سامنے پیش کرتا، میں ان تقریروں کی اغلاط اور غیر فصیح اقتباسات وعبارتوں کی تصحیح کرتا ،اس طرح ہندوستان میں عربی ادباء کی ایک ٹیم تیار ہوگئی،اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں عربی ادب کی تعلیم ترجمہ کی بنا پر چل رہی تھی ،جب استاد نحو وادب کی کتابیں مثلاً دیوان حماسہ، دیوان متنبّی ،مقامات اور معلقات جیسی کتابوں کی تدریس اپنے ذمہ لیتا تو وہ اس کا ترجمہ بتاتا تھا،اصل کتاب نہیں پڑھاتا تھا۔

دیوان متنبّی کا ایک دلچسپ واقعہ:

یہاں پر ایک واقعہ کا ذکر جو میرے ساتھ علی خاں کے مدرسہ میں (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) پیش آیا تھا،ضروری معلوم ہوتا ہے،تا کہ اس کے ذریعہ ترجمہ کی بنیاد پر عربی زبان کی تدریس وتعلیم کی غلطی واضح ہو سکے۔

اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں کہ نواب صدرالدین رحمہ اللہ نے مجھے عربی ادب کی تدریس کے لئے اپنے مدرسہ میں بلایا تھا،تا کہ طلبہ ایک عربی استاذ کی زبان سے عربی سن کر اس کو سمجھنے کے عادی ہوسکیں اور کسی عرب کی آواز ان کے لئے نامانوس نہ رہے،انہوں نے مدرسہ کے مہتمم شیخ احمد اللہ سے کہہ دیا کہ وہ کچھ ممتاز اور فائق طلبہ کا انتخاب کر کے میرے پاس بھیج دیں،انہوں نے پندرہ طلبہ کا انتخاب کیا، جب مدرسہ کے استاذ عربی ادب مولانا عبدالرحمان بلگرامی کو اس کا علم ہوا تو بہت غصہ ہوئے،اور طلبہ سے کہنے لگے ،نواب صاحب نے اس سلسلہ میں بہت غلطی کی، یہ عربی نوجوان بالکل جاہل ہے اور ہندوستان میں متعارف بھی نہیں ممکن ہے کہ اس سے تمہیں جو ڈگری ملے وہ کام نہ آئے ،علم وتعلیم تو عرب سے مدت ہوئی مکہ ختم ہوچکی ۔تم نے دیکھا ہوگا کہ ہر سال مکہ مدینہ سے آآ کر یہ لوگ بھیک مانگتے ہیں، کیا کبھی کسی عالم کو دیکھا ہے جو عرب سے پڑھانے آیا ہو،تم لوگ نواب صاحب کے پاس جاؤ اور کہو کہ جناب! معاف فرمایئے ،ہم اس مراکشی سے نہیں پڑھیں گے، کیوں کہ نہ تو ہم ان کی بات سمجھ سکتے اور نہ وہ ہماری بات سمجھیں گے،طلبہ نے کہا ،ہمیں نواب صاحب کے پاس دوبارہ جانے میں شرم آرہی ہے،انہوں کہا،تو سن لو پھر میں تم کو کوئی ڈگری نہیں دوں گا،اسی مراکشی سے ڈگری لینا۔تین چار دن دیوان متنبّی پڑھانے کے بعد قصیدہ کے اس شعر تک پہنچے جس میں متنبّی سیف الدولہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

انالہ الشرف الاعلی نقدمہ

فما الذی یتوفی ما اتی نال

دیوان کا دہلی کا مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر تھا۔دوسرا مصرعہ میری سمجھ میں نہ آیا تو میں نے طلبہ سے کہا لگتا ہے کہ یہ غلط درج ہوگیا ہے،،طلبہ کہنے لگے ،مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے سچ کہا تھا کہ آپ کو کچھ نہیں آتا ہے،آپ عربی النسل اور عالم ہوکر بھی متنبّی نہیں سمجھ سکے،توبہ استغفر اللہ!! (یہ جملہ اردو میں غصہ اور ناراضگی کے وقت بولا جاتا ہے) ،میں نے ان سے کہا کہ شاید یہ طباعت کی غلطی ہے،طلبہ کہنے لگے،نہیں غلطی نہیں ،مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے اسی نسخہ میں ہمیں بار بار پڑھایا اور پورا دیوان ختم کرایا ہے،لیکن انہوں نے اس میں کبھی کوئی غلطی نہیں پائی، یہ آپ کی کم علمی ہے،اس کے بعد وہ لوگ عبدالرحمٰن صاحب کے پاس چلے گئے ،(شیخ نے یہ واقعہ اپنے ندوہ کے محاضرات میں بھی بار بار سنایا تھا، جو الضیاء میں شائع

ہوئے ہیں)اوران سے جا کر کہنے لگے کہ مراکشی صاحب نے اس مصرعہ کے بارے میں کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ شاید یہ غلط ہے،انہوں نے کہا یہ مصرعہ بالکل درست ہے،اس کو ہر کس وناکس بلکہ گدھا تک سمجھ لے گا،مولانا صاحب کے اس کہنے کی وجہ سے گیارہ طلبہ میرے پاس سے ان کے پاس چلے گئے ،صرف چار طالب علم رہ گئے ،حالاں کہ وہ بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نے نہیں سمجھا ہے لیکن ایک عرب کی زبان سے عربی سننے کے شوق میں وہ میرے ہی پاس رہے ،اس کے بعد میں تنہائی میں اس مصرعہ پر چار دن مسلسل غور کرتا رہا لیکن پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا،اس کے بعد میں عبدالرحمٰن صاحب کے پاس گیا،طلبہ چاروں طرف بیٹھے تھے اور وہ ان کو پڑھا رہے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا ،انہوں نے جواب دیا، پھر میں نے عرض کیا،شیخ! یہ مصرعہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اور طلبہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو سمجھ میں آ گیا ہے،ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ہم کو سمجھا دیں گے،انہوں نے کہا،اس کی اصل یہ ہے، فما الذی یتوقی الاعداء ما اتاہ الممدوح من الاقوام نالوہ

یہاں پر لام امر کے بعد واو اور الف ہونا چاہئے؛ لیکن غلطی سے نہیں لکھا جاسکا ہے، میں نے ان سے کہا کہ مجھے تو سمجھ میں نہیں آیا ،امید ہے کہ آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے،اور اعراب کی توضیح بھی کریں گے، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ ما موصولہ ہے اور الذی اس کی تاکید کے لئے ہے،اور یتوقی فعل مضارع اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے،اس کی مکمل عبارت یہ ہوگی،"ھم یعودوا علی الاعداء فی البیت الذی قبلہ " ما موصولہ، یتوقی فعل کا مفعول ہے، جو حقیقتا اتاہ ہوگا ،نالوا فعل با فاعل ۔ میں نے ان سے کہا جب ہم کہیں گے کہ ما موصولہ ہے اور الذی بھی موصولہ ہے تو تقدیر عبارت ہوگی'' الذی الذی'' مولانا نے کہا،کوئی حرج نہیں ، میں نے ان سے کہا ایسا بالکل نہیں ہوسکتا کہ یتوقی کا فاعل پوشیدہ ضمیر کو مانا جائے ، کیوں کہ اس کی تقدیر ھم ہے ،اگر جمع مقصود ہوتا تو ضمیر ظاہر ہو جاتی ،اور یہ صیغہ یتوقون ہوتا ،اس پر وہ کہنے لگے ،آپ متنبّی پر اعتراض کرتے ہیں؟! میں نے کہا میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں بلکہ سمجھنا چاہتا ہوں ، پھر کہنے لگے کہ بوعلی فارسی چند دن دیوان متنبّی میں غور کرتے رہے لیکن پھر بھی کوئی غلطی نہیں نکال سکے،اس پر میں نے کہا کہ متنبّی نے بعض مقامات پر غلطی کی ہے،جس پر علمائے بلاغت نے نقد کیا ہے،اس کا قول ہے

خضجت وھم لا یفجون لھا بھم
شیم علی الحبیب الاغر دلائل

اس میں تعقید ہے،لفظ خضعت بڑا نامانوس اور ثقیل ہے،اسی طرح اس کے اور اشعار پر بھی لوگوں کو اعتراض ہے۔اس شعر میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی قباحتیں موجود ہیں،اس کے دیوان کے شروح کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات مزید واضح ہوجائے گی کہ وہ غلطی سے محفوظ نہیں ہے،، جناب نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے جو طالب علم پڑھ رہا تھا اس سے کہا ''چلو''یعنی آگے پڑھو (شیخ نے یہاں دلچسپ جملہ کہا تشلو یعنی اقرا)اس وقت مجھے بہت رنج ہوا،تب میں نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ ہم مطبع مجتبائی والے سے کسی کتاب کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو کیا کہیں گے،اس نے مجھے اردو کے الفاظ بتائے ، میں مطبع مجتبائی گیا اور جا کر اس کے مالک سے پوچھا ،کیا آپ کے پاس دیوان متنبّی کی شرح عکبری کا کوئی نسخہ برائے فروخت موجود ہے،اس نے کہا،آخری نسخہ بچا تھا کل وہ بھی فروخت ہوگیا، پھر انہوں نے بتایا کہ ایک طالب علم نے یہ کتاب خریدی ہے، چنانچہ میں اس طالب علم کے پاس پہنچا، وہ میرے پاس کتاب لے کر آیا،اس میں نے یہ شعر اور اس کی تشریح پڑھی،حسب توقع تو اس مصرعہ کا محرف ہونا ثابت ہوگیا،اس کی صحیح عبارت اس طرح تھی۔

اناله الشرف الاعلیٰ تقدمه فما الذی یتوقی

ما اتی نالو؟

تب جا کر یہ بات واضح ہوئی کہ جس ما کوموصولہ سمجھا گیا تھا وہ استفہامیہ تھا، پھر یہ بھی سمجھ میں آیا کہ وہ فعل جس کے لئے انہوں نے فاعل تراشا تھا اور اس کی تقدیر ھـــم سے نکالی تھی اصلا وہ فعل ہے ہی نہیں بلکہ وہ جار مجرور ہے، اور اسی کے ذریعہ مصرعہ کا مفہوم واضح ہوا، پھر میں نے شعر نوٹ کیا، اس کی تشریح نوٹ کی اور لے کر مولانا موصوف کے پاس پہنچا، اور سلام کر کے ان سے کہا، شیخ! آپ نے جس مصرعہ کے بارے میں طلبہ سے فرمایا تھا کہ اس کو ہر کس و ناکس حتی کہ گدھا بھی سمجھ سکتا ہے، خود آپ نے اس کو نہیں سمجھا ہے، لیجئے پڑھ لیجئے، انہوں نے وہ صفحہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیا اور ایک حرف ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ یہ قصہ باعث عبرت ہے اس لئے یہاں بیان کر دیا گیا۔

ہندوستان سے جانے کے بعد میں نے بصرہ (عراق) کے مدرسہ النجاۃ میں تین سال پڑھایا، پھر یورپ چلا گیا، وہاں استاد بھی رہا اور جرمنی میں بون یونیورسٹی کا (پی ایچ ڈی کا) طالب علم بھی۔ ۱۹۴۷ء میں تھوڑی مشقت کے بعد یورپ سے عراق پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، وہاں بغداد یونیورسٹی کے ملکہ عالیہ کالج میں بحیثیت استاد قرآن وحدیث اور ادب عربی میرا تقرر ہوا، لیکن وہاں کا وزیر اعظم صالح جبر جو اثنا عشری شیعہ کا بڑا لیڈر تھا اس نے مجھے اپنے متعینہ منصب پر کام کرنے اور بحال ہونے سے روک دیا، اور وجہ یہ بتائی کہ میں دوسری حکومت کا پاسپورٹ لے کر عراق آیا ہوں، اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جاننے والوں نے بتایا کہ شہریت سے محرومی اسی وقت ممکن ہے جب انسان کوئی ایسا جرم کرے جس کی بنا پر مجلس وزراء (پارلیمنٹ) یہ فیصلہ کرے کہ اس کا مجرم حق شہریت سے محروم کیا جائے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صالح جبر نے اپنے گروہ اور اہل مسلک کے تعصب میں میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، کیوں کہ محترم طہ فیاض صاحب اور ایک پولیس اہل کار کی مدد سے دفتر تعزیراتی تحقیق جا کر مجھے اپنی مخصوص فائل دیکھنے کا موقع مل گیا، اس میں دیکھا، ان کا دعویٰ تھا کہ میں فرقۂ جعفریہ یعنی شیعوں کا دشمن اور مخالف ہوں، حالانکہ میں نے کبھی بھی ان سے علانیہ دشمنی کا اظہار نہیں کیا تھا، ہاں صرف ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایران کے کسی شیعہ مضمون نگار کا ایک مضمون مجلّہ المنار مصر میں پڑھا تھا جس میں انہوں نے وہ دلائل پیش کئے تھے جن کو دیکھ کر یہ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اہل بیت قبوں اور پختہ قبروں کے مخالف رہے ہیں، اور ان پر ہونے والی بدعات کو حرام قرار دیتے تھے، ان روایات میں حضرت جعفر صادق کا یہ قول بالخصوص قابل ذکر ہے کہ ''قبر پر مٹی کے علاوہ جو چیز بھی رکھی جائے وہ میت کے لئے بوجھ بن جاتی ہے''۔ اسی طرح صحیحین کی روایت ہے کہ ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا''۔ اس حدیث کو اس مقالہ میں اہل بیت کے سلسلۂ سند سے پیش کیا گیا تھا، اس کے علاوہ دوسری احادیث وآثار بھی تھیں جن سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ ائمۂ اہل بیت کی رائیں اس سلسلہ میں وہی ہیں جو عام اہل سنت والجماعت کی ہیں، ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، اور جاہلوں کے بقول تو انہیں وہابی کہنا چاہئے۔

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد میں نے شیعہ مجتہد سید مہدی قزوینی کو خط لکھا اور وہ تمام احادیث پیش کر کے ان سے سوال کیا کہ کیا یہ احادیث صحیح ہیں، اگر صحیح ہیں تو پھر ان کو قبول کرنے اور ان کے احکام کی تنفیذ میں آخر کون سی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے اس کے جواب میں مجھے بہت مفصل اور طویل خط لکھا جس میں ان احادیث میں سے کسی پر نقد تو نہیں کیا البتہ ان کی تاویل کی اور دوسرا مفہوم بتایا، اور اس شیعہ مضمون نگار اور ایڈیٹر المنار کو سخت سست کہا، اور خط کے اخیر میں مجھ سے درخواست کی کہ

میں اس شیعہ اور مدیر المنار کے درمیان محاکمہ کروں، چنانچہ میں نے سات قسطوں میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا القضاء العدل فی حکم البناء علیٰ القبور۔

اس میں میں نے مذکورہ شیعہ صاحب کے خلاف صاحب المنار کے حق میں فیصلہ کیا، صرف طرف داری میں نہیں بلکہ اس لئے کہ حق انہیں کا قول تھا، یہ تفصیلی مقالہ المنار میں شائع ہوا، پھر تمام قسطیں کتابی شکل میں یکجا ملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود کے حکم سے شائع ہوئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی بنیاد پر ان کا دعویٰ تھا کہ میں شیعوں کا مخالف ہوں۔ اس مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجائے گا کہ تمام ائمۂ اہل بیت جن کی طرف شیعہ خود کو منسوب کرتے ہیں سب کے سب اہل سنت کے ساتھ قبروں کی بدعات کی حرمت پر متفق ہیں۔ اس مضمون میں میں نے خاص شیعی عقائد سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ انہوں نے فائل میں میرے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ غلط تھا، چنانچہ سات مہینے تک میں ہونہی رہا۔ اس کے بعد ایک انقلاب برپا ہوا، اور بغداد میں کئی مظاہرے ہوئے جن میں چالیس آدمی مارے گئے، پوری پارلیمنٹ ٹوٹ گئی، صالح جبر اور نوری سعید بھاگ گئے، پھر محمد سعید نے مجلس وزراء (پارلیمنٹ) کی صدارت سنبھالی، اور فورا مجھے شہریت کا پروانہ دے دیا، اس کے بعد میں نے یونیورسٹی میں اپنا کام شروع کردیا۔ سید محمد الصدر بھی شیعہ ہی تھے لیکن معتدل تھے، صالح جبر کے ظالمانہ سلوک سے خوش نہیں تھے۔ چار سال بعد ترقی کرکے میں معاون مدرس ہوگیا۔

اسی دوران میرے پاس ایک خط آیا جس میں گذارش کی گئی تھی کہ میں بون یونیورسٹی جرمنی میں شعبہ علوم مشرقیہ کے حصہ علوم اسلامیہ کی ایک سال تدریسی نمائندگی کروں، وہاں میں ترقی کرکے پروفیسر کے عہدہ تک پہنچ گیا، واپسی کے بعد ٹریننگ کالج بغداد منتقل ہوگیا کیوں کہ ملکہ عالیہ کالج گرلز کالج تھا، پھر جب بغداد یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم عام ہوگئی اور لوگ اس سے مانوس بھی ہوگئے تو ملکہ عالیہ کالج (جس کا نام انقلاب کے بعد کلیۃ التحریر یعنی آزادی کالج ہوگیا تھا) تقریبا معطل ہوگیا۔ ٹریننگ کالج (کلیۃ التربیۃ) میں میں ۱۹۵۹ء تک استاد رہا، جب عبدالکریم قاسم نے اپنی شیعہ حکومت میں کمیونسٹوں کو کمیونسٹ حکومتوں کی چاپلوسی اور ان کو خوش کرنے کی خاطر آزاد کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظلم وزیادتی کرنے لگے، جس کو چاہتے قتل کرڈالتے، یا قید کردیتے، گردن میں رسی ڈال کر سڑکوں پر اس قدر گھسیٹتے کہ وہ مرجاتا، قیدیوں کو رات میں سزائیں دیتے، البعث پارٹی کے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کرتے اور قتل کردیتے، اس میں مسلمان وملحد کا کوئی فرق ملحوظ نہیں تھا، سب کے ساتھ یہی سلوک تھا، کیوں ان کے بقول جو ان کا حامی نہیں تھا وہ ان کا مخالف شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی جان کا خطر محسوس ہوا تو میں بہ تدبیر عراق سے خاموشی سے نکل کر مراکش پہنچ گیا، وہاں محمد الخامس یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) میں تدریس کے لئے میرا انتخاب ہوگیا، یہاں میں ۱۹۶۸ء مطابق ۱۳۸۸ھ تک رہا، اس کے بعد میں نے حج کے لئے حجاز کا سفر کیا، اسی اثناء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے شیخ الجامعہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے مجھے وہاں تدریسی خدمت قبول کرنے کو کہا، اور ساتھ ہی مراکش کے وزارت تعلیم کو سعودی وزارت خارجہ کے توسط سے اس کی درخواست بھی پیش کردی، وہاں سے اسے منظوری مل گئی اور میں جامعہ میں تدریسی خدمت انجام دینے لگا اور اب تک اسی خدمت میں مشغول ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میری تعلیم کو خالص اپنی رضا کا ذریعہ بنائے، اور قبولیت سے سرفراز فرمائے، (شیخ محمد المجذوب مرتب مضمون نے اس پر حاشیہ میں لکھا ہے، استاد نے ۱۳۴۹ھ میں جامعہ کی خدمت سے سبکدوشی اختیار کرلی تاکہ مراکش میں

پوری فراغت کے ساتھ دعوت کا کام کرسکیں)

مجلسوں میں درس دینا اور مجالس وعظ میں وعظ کہنا اب تک میرا معمول ہے، اور مشرق ومغرب ہر جگہ میں نے ہمیشہ اس کا التزام کیا ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے۔

تصانیف:

جس سال میں نے خواب میں حضور ﷺ کی زیارت کی تھی اور آپ ﷺ نے مجھے طلب علم کا حکم دیا تھا، اسی میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک درخت میری دہنی پشت پر اگا اور اس کی شاخیں دنیا کے اطراف واکناف میں پھیل گئیں اور اتنی بڑھیں کہ ان کے آخری گوشے میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، اس کا مطلب میں نے سمجھا تھا کہ میں علم حاصل کروں گا اور ایسی کتابیں تصنیف کروں گا جو پورے عالم میں پھیل جائیں گی، لیکن شاید یہ تعبیر غلط تھی بلکہ ان کی تعبیر یہ مقالات ہیں جن کو میں نے مختلف مجلّات میں شائع کروایا ہے، ہندوستان اور عرب کے رسائل میں میرے بے شمار مقالات ومضامین شائع ہوئے ہیں، ان کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی بہت سے مضامین شائع ہوئے، کچھ چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے اور شائع کروائے جن میں کچھ کا یہاں تذکرہ کررہا ہوں۔

۱۔الزند الواری والبدر الساری فی شرح صحیح البخاری جلد اول فقط۔۲۔الالہام الانعام فی تفسیر سورۃ الانعام۔۳ فی مسالۃ السفور والحجاب۔۴ القاضی العدل فی حکم البناء علی القبور۔۵ الانوار المتبعۃ فی تحقیق سنۃ الجمعۃ۔۶ فضل الکبیر المتعالی (دیوان شعر محمد تقی الہلالی)۔۷قبسۃ من انوار الوحی۔۸ الصبح السافر فی حکم صلاۃ المسافر۔۹ العلم الماثور والعلم المشہور واللواء المنشور فی بدع القبور۔۱۰ مدینۃ العرب فی الاندلس (انگریزی سے ترجمہ)۔۱۱ آل ال البیت ما لھم وما علیھم ۱۲ البراھین الانجلیزیۃ علی ان عیسیٰ داخل فی العبودیۃ وبری ء من الالوھیۃ۔۱۳ دواء الشاکین وقامع المشککین فی الرد علی الملحدین۔۱۴ احکام الخلع فی الاسلام۔۱۵ حاشیۃ علی کتاب التوحید لشیخ الاسلام محمد بن عبدالوھاب۔۱۶ رسالۃ الدکتوراۃ (ترجمۃ مقدمۃ کتاب الجواھر فی الجماھر والتعلیق علیھا)۱۷۔الطبقات عند العرب۔۱۸السان الدین (اس مجلّہ کی پہلی جلد جس کو میں تطوان سے نکالتا تھا)۱۹التمثیلیات محمد دانیال (تعارف وذکر مشمولات)۔۲۰مختصر ھدی الخلیل فی العقائد وعبادۃ الجلیل۔۲۱ الھادیات (ابتدائی دور کے چار قصیدے) رحلۃ (زبیر عراق سے جنیوا تک کا سفرنامہ)۲۳۔من یرافقنی الی برلین بقسمیھا الشرقی والغربی۔۲۴ رحلۃ الی درعۃ فی الجنوب الشرقی من المغرب۔۲۵ رحلۃ الی المانیۃ۔۶۲ تاریخ اللغۃ السامیۃ۔۷۲ دلیل الحاج فی مناسک الحج۔۲۸ الصدیقات الثلاث (قصہ وافسانہ)۲۹ فکاک الاسیر العانی المکبول بالکبل التیجانی۔۳۰ حاشیۃ علی کشف الشبھات لشیخ الاسلام محمد بن عبدالوھاب۔ ۳۱۔حواشی شتی علی انجیل متی۔۳۲۔الحسام الماحق لکل مشرک ومنافق۔۳۳ العقود الدریۃ فی منع تحدید الذریۃ۳۴۔الرجعیۃ والتقدم۔۳۵۔سب القادیانیین للاسلام والرد علیھم۔۳۶۔تقویم اللسانین ۳۷۔اھل الحدیث۔

☆☆☆

❑ علم وتحقیق

حضور پاک ﷺ کی تاریخ ولادت محققین مصنفین کی نظر میں

محمد سہیل ندوی
(مدرسۃ العلوم الاسلامیہ)

سیرت طیبہ میں بعض واقعات ایسے مشہور ہو چکے ہیں جن کی کوئی سند اور حقیقت نہیں ہے، بسا اوقات اہل علم بھی ان سے دھوکہ کھاتے ہیں اور ان کو اپنی تقریر وتحریر کا حصہ بناتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام بھی بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ ان من گھڑت و بے بنیاد واقعات کو حقیقت سمجھتے ہوئے نہ صرف ان پر اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ بطور دلیل ان کو بیان کرنے لگتے ہیں، ایسے واقعات کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم ان واقعات کی ہے جو بالکل من گھڑت اور بے بنیاد ہیں اور دوسری قسم ان واقعات کی ہے جن کی سندیں نہایت کمزور اور ضعیف ہیں، اور اسی دوسری قسم میں وہ واقعات بھی رکھے جا سکتے ہیں جن کی تاریخ کے تعین میں اختلاف ہے، امانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کی طرف بچوں اور بڑوں کی توجہ مبذول کرائی جائے اور جہاں کہیں بھی اختلاف پیش آئے یا کوئی بات واضح نہ ہو رہی ہو وہاں عام سیرت نگاروں کی طرف رجوع کرنے کے بجائے محققین مصنفین کی تحقیقات وتصنیفات کی طرف رجوع کیا جائے، انہوں نے جس قول کو اختیار کیا ہے یا جس بات کو مستند قرار دیا ہے اس کو اختیار کیا جائے تاکہ راجح ومرجوح، مستند وغیر مستند اور صحیح وسقیم میں فرق کرنا آسان ہو۔ محدثین ومؤرخین، اصولیین وناقدین اور محققین نے اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو اسی لیے فنا کیا تاکہ سیرت اور آپ ﷺ کی احادیث کے ذخیرہ میں رطب ویابس کے جمع ہونے کا کوئی امکان نہ رہ جائے، شکوک وشبہات اور مغالطہ کی کیفیت کا بآسانی ازالہ ہو، چنانچہ محدثین نے کھرے کھوٹے اور سیاہ وسپید کے درمیان فرق کو بالکل واضح کر دکھایا ہے، بلکہ ناقدین اصولیین اور ائمہ جرح وتعدیل نے اپنا یہ دعویٰ سچ کر دکھایا کہ ''آپ ﷺ کی حدیثوں سے ہم جھوٹی اور غیر مستند باتوں کو اس طرح نکال باہر کریں گے جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے'' (اللہ ان کو جزائے خیر دے اور ان کی تحقیقات کو ذخیرۂ آخرت اور نجات کا سامان بنادے) فن اسماء رجال اور راویوں کی تحقیق وتعارف کا پورا شعبہ اسی لیئے وجود میں آیا کہ کسی بھی غیر مستند بات کو آپ ﷺ کی طرف منسوب نہ کیا جا سکے، ہر کس وناکس کی بات کو حجت اور قابل استناد نہ سمجھا جا سکے؛ بلکہ کوئی بھی بات آپ ﷺ کی جانب منسوب کی جائے تو جب تک محدثین کے اصولوں کے مطابق وہ صحیح معیار پر نہ اترے اس کو لائق استناد نہ سمجھا جائے، اس قدر احتیاط اور حفاظت کے باوجود بہت سی بے بنیاد باتیں کم علمی یا بے توجہی کی بنیاد پر آپ ﷺ کی جانب منسوب کر دی گئیں اور وہ عوام کے درمیان مشہور ہو گئیں، اور مشہور ہونے کی بنیاد پر ان کو خوب نقل کیا جاتا رہا اور مستند سمجھ کر بیان کیا جاتا رہا، لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی بات کے مشہور ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ درست اور صحیح اس لئے ہوگی کہ وہ لوگوں کے درمیان مشہور ومعروف ہے، آپ ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ سے منسوب واقعات میں

بہت احتیاط اور چوکنّا رہنے کی ضرورت ہے، عام لوگوں میں تحقیق کا مزاج اور تلاش وجستجو کی عادت نہیں ہے، جو باتیں معاشرہ میں چلادی گئیں یا مشہور ہوگئیں ان ہی کو حقیقت سمجھا جانے لگا ہے، تدبّر اور غور وفکر کی صلاحیت کو استعمال کرنے کی عادت نہیں رہی، لوگ رسم ورواج کے پابند ہوگئے ہیں۔

جس طرح یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی ہے، یہ تاریخ، ریاضی اور علم ہیئت کے اعتبار سے غلط ہے، علامہ شبلی نعمانی ہوں یا علامہ محمد سلیمان سلمان منصور پوری، محمود احمد فلکی مصری ہوں یا ابن اثیر جزری، اور ان کے علاوہ کتنے ایسے مصنفین ہیں جنھوں نے پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ۹ ربیع الاول اور وفات ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی ہے، عجیب بات ہے کہ لوگوں کے زبان پر ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ اور اس کے چرچے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی کتاب ''سیرۃ النبی'' میں لکھتے ہیں کہ ''تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ۹ ربیع الاول روزِ دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔

مزید فرماتے ہیں کہ محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحات میں ہے لیکن اس کا خلاصہ اور لبّ لباب ہم آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں: ''صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم ؓ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا (ابواب الکسوف باب الصلوۃ فی کسوف الشّمس ج ۱، ص ۱۴۲) اور ۱۰ھ تھا، (اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا)

ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۰ھ کا) گرہن، ۷ جنوری ۶۳۲ء کو ۸ بج کے ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔

اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری اعتبار سے ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپ ﷺ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے، جس میں از روئے قواعد ہیئت، ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔ (سیرۃ النبی، علامہ شبلی نعمانی، ج ۱ ص ۱۲۱)

علامہ محمد سلیمان سلمان منصور پوری اپنی کتاب ''رحمۃ للعالمین میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے نبی ﷺ موسم بہار میں دوشنبہ (پیر) کے دن ۹ ربیع الاول عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء ہے، مطابق یکم جیٹھ ۶۲۸ بکرمی کو مکہ معظّمہ میں بعد از صبح صادق ۸ قبل از طلوع نیر عالم تاب پیدا ہوئے''۔

مزید حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ''تاریخ ولادت میں مؤرخین نے اختلاف کیا ہے، طبری وابن خلدون نے ۱۲ تاریخ اور ابو الفداء نے ۱۰ لکھی ہے، مگر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن تھا، چونکہ دوشنبہ کا دن ۹ ربیع الاول کے سوا کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لئے ۹ ربیع الاول ہی صحیح اور درست ہے، تاریخ دول العرب والاسلام میں محمد طلعت عرب بک نے بھی ۹ تاریخ ہی کو صحیح قرار دیا ہے، واقعہ عام الفیل سے ۵۵ ایام کے بعد ۲۲ اپریل گریگورین رول کے مطابق ہے جس پر ستمبر ۱۷۵۲ء سے انگریزی تقویم کا حساب شروع ہوا ہے لیکن قاعدہ قدیم کے مطابق ۹ ربیع الاول مطابق ۱۹ اپریل ۵۲۸۴ء جولین کے تھی اور گریکورین نے اس ۱۹ کو ۲۲ اپریل ۵۷۱ء بروئے حساب قدیم قرار دیا ہے۔

واضح ہو کہ شمسی سال کی صحیح مقدار ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۶ سیکنڈ ہے، مگر سمت پروشٹھ کے جاری کرنے والوں نے ۲۳ منٹ ۲۳ سیکنڈ کی مقدار اس سے زیادہ تجویز کی ہے۔ اس زیادتی کی وجہ سے سمت پروشٹھ سنہ عیسوی کے مقابلہ میں ۲۳ منٹ ۲۳ سیکنڈ کی

تاخیر سے شروع ہوتا ہے۔سمت پروشٹہ ۱ کا آغاز یوم یکشنبہ (مطابق ۱۴مارچ ۴۶۵۷ء جولین) ہوا تھا، یعنی اعتدال ربیع سے ۹ یوم پہلے۔ مگر سمت ۶۲۸ پروشٹہ کا آغاز ۲۲ مارچ ۵۷۱ء کو ہوا تھا، یعنی اعتدال ربیعی سے ایک یوم کے بعد اور ہمارے زمانہ میں سمت ۱۹۷۲ پروشٹہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۵ء کو شروع ہوا ہے یعنی اعتدال ربیعی سے ۲۳ یوم بعد، آئندہ بھی سمت پروشٹہ میں اسی تناسب سے یہ فرق بڑھتا رہے گا یعنی ۶۱/۱/۲ سال کے بعد سمت کا شروع ایک دن مؤخر ہوتا رہے گا۔غرض سمت پروشٹہ میں جو غلطی متعلق مقدار سال شمسی کے ابتدائے قائمی سمت مذکور سے موجود ہے۔اسی کی وجہ یہ ہے کہ سمت ۶۲۸ پروشٹہ کا یکم جیٹھ بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء تھا۔اور سمت ۱۹۷۲ پروشٹہ کا یکم جیٹھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء کے ہے۔ یوم ولادت با سعادت کو مکہ معظّمہ میں صبح صادق کا طلوع ۴ بج کر ۲۰ منٹ (دھوپ گھڑی کے حساب سے) یا ۹ بج کر ۵۷ منٹ (حساب مروجہ حال عرب سے) ہوا تھا اور آفتاب اس وقت برج حمل سے ۳۱ درجہ ۲۰ دقیقے پر تھا اور تاریخ یکم جیٹھ کے شروع ہونے پر ۱۳ گھنٹے ۱۶ منٹ گزر چکے تھے''۔(رحمۃ للعلمین، جلد ا، صفحہ ۶۲)

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اپنی کتاب ''الرحیق المختوم'' میں نقل فرماتے ہیں کہ'' رسول اللہ ﷺ مکہ میں شعب بنی ہاشم کے اندر ۹ ربیع الاول ۱ عام الفیل یوم دوشنبہ کو صبح کے وقت پیدا ہوئے، اس وقت نوشیرواں کی تخت نشینی کا چالیسواں سال تھا اور ۲۰ یا ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کی تاریخ تھی، علامہ محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوریؒ اور محمود پاشا فلکی کی تحقیق یہی ہے''۔

اور اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں کہ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے'' ولادت کے وقت بعض واقعات نبوت کے پیش خیمہ کے طور پر ظہور پذیر ہوئے ، یعنی ایوان کسریٰ کے چودہ کنگورے گر گئے۔ مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بحیرہ سادہ خشک ہو گیا اور اس کے گرجے منہدم ہو گئے۔ یہ بیہقی کی روایت ہے لیکن محمد غزالی نے ''فقہ السیرۃ'' میں اس کو درست تسلیم نہیں کیا ہے''۔

(الرحیق المختوم، جلد ا، صفحہ ۱۰۰)

شیخ محمد بن عثیمین تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے متاخرین فلکیوں نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کا دن ۹ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲ ربیع الاول۔(القول المفید علیٰ کتاب التوحید (۴۹۱/۱) طبع اول ۱۴۱۸ھ، دار الجوزی، دار العاصمۃ)

شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن محمد سلیم اپنی کتاب ''تقویم الأزمان'' میں لکھتے ہیں کہ'' کتب تاریخ وسیر میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت پیر کے دن ۱۰ ربیع الاول کو ہوئی ہے اور بعض کتابوں میں ۸ ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ ذکر کی گئی ہے، جمہور علماء نے ۸ ربیع الاول کو شواہد ودلائل کی بنیاد پر درست مانا ہے، اس سے یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کا یوم ولادت ۲۰/اپریل ۵۷۱ء ہے''۔

ابن کثیر نے مختلف مصنفین کے چھ اقوال نقل کئے ہیں جن میں مختلف تاریخیں ذکر کی گئیں ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک قول بھی درست اور تاریخ کے موافق نہیں ہوتا، مزید برآں حضرت جابرؓ اور ابن عباسؓ کی حدیثوں میں ۱۲ ربیع الاول کی تعیین کی گئی ہے اگر وہ اپنی سند کے اعتبار سے درست اور صحیح ہوتیں تب بھی اس قول کو تقویت وترجیح حاصل ہو جاتی لیکن وہ ضعیف ہیں، ابن کثیر نے ان کی سندوں میں انقطاع بتایا ہے۔(البدایۃ (۱۰۹/۲)

اس تحقیق سے معلوم یہ ہوا کہ آپ ﷺ کی ولادت کے سال، مہینہ اور دن میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، تمام مؤرخین و مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ دن پیر، مہینہ ربیع الاول اور سال ۵۷۱ء ہے، لیکن کلینڈر اور تقویم کے لحاظ سے تاریخ میں فرق آجاتا ہے جس کو بہت تفصیل کے ساتھ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے حل فرمادیا ہے، یعنی ۹ ربیع الاول ہی آپ ﷺ کا یوم پیدائش ہے، اسی کو ہر اعتبار سے ترجیح حاصل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

فکر و نظر

اسلامی تشخص اور ہندوستانی مسلمان

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

اسلامی تشخص کے بغیر مسلمان کی حیثیت جسم بلا روح اور لاشئہ بے جان کی ہے، اگر انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے لقد کرمنا بنی اٰدم (سورۂ اسراء:۷) ''اور ہم نے اولاد آدم کو عزت دی ہے'' اور لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ (التین:۴) ''حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت و پرداخت کے ساتھ وجود عطا کیا ہے'' تو مسلمان کو اللہ نے افضل امم قرار دیا ہے کنتم خیر امة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون بالله، (آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین امت ہو، تمام انسانوں کے لیے اس امت کو برپا کیا گیا ہے، تمہیں بھلائیوں کا حکم دینا ہے، برائیوں سے روکنا ہے اور اللہ پر ایمان رکھنا ہے''۔ اس احساس کا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے، اگر یہ احساس مر گیا تو تشخص (Identity) کے ختم ہوتے دیر نہیں لگتی، تشخص کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا ایمان پختہ ہو، اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ فما ذا بعد الحق الا الضلال۔ (یونس:۳۲) ''اور حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا رہ جاتا ہے''۔ کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں دو ہی شناخت ہیں، اچھی یا بری، صحیح یا غلط، حق یا باطل درمیان کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں، دو شناختوں کے علاوہ تیسری کوئی شناخت نہیں، ایک شناخت عالمی و آفاقی و ربانی و نبوی ہے، دوسری اس کے برعکس ہے، ایک کی بنیاد آخری اور عالمی نبی، آخری اور ابدی و عالمی کتاب پر ہے، وما ارسلنك الا رحمة للعالمين۔ (انبیاء:۱۰۷) ''اور ہم نے آپ کو تمام طبقات کے لیے رحمت بنایا ہے''۔ قل یا ایها الناس انی رسول الله إلیكم جمیعا۔ (اعراف:۱۵۸) ''کہہ دیجئے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیامبر ہوں'' وما ارسلنٰك إلا كافة للناس بشیرا و نذیرا۔ (سبا:۲۸) ''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنایا ہے''۔ لیكون للعلمین نذیرا۔ (الفرقان:۱) ''تاکہ اللہ کا بندہ سارے انسانی طبقات اور ساری دنیا کو باخبر کردے'' هدی للناس۔ (بقرہ:۱۸۵) ''قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت نامہ ہے'' اور اس کے برخلاف دوسرے تشخصات یا تو منسوخ بنیادوں پر قائم ہیں یا ان انسانی نظریات پر جو صدی نصف صدی میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اسلامی تشخص کے دامن میں تابناک تاریخ ہے، شاداب و درخشاں معاشرہ ہے، اس کا چہرہ پرکشش ہے، امن واطمینان، عدل و مساوات، رحم پروری و کرم گستری، حقوق کی عادلانہ تقسیم، اپنے مالک حقیقی کے سامنے انا قربان کرنے کے ساتھ ہر شخص کی انا و عزت نفس کا بھرپور لحاظ، خالق و مخلوق کا بے حجابانہ تعلق اس کی شناخت ہے، اس کی انسانیت نوازی اور رواداری بے

نظیر و عدیم المثال ہے جس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے، لا اکراہ فی الدین۔ (بقرہ:۲۵۶)''دین کے معاملہ میں جبر اورزبردستی نہیں ہے''۔اور لکم دینکم ولی دین۔ (کافرون:۶)''تم اپنے دین کو لیے رہواور میں اپنے دین پر قائم ہوں''، گویا ایک طرف واضح طور پر زور زبردستی سے منع کیا گیا اور دوسری طرف اپنے تشخص میں کسی طرح کے جھول اور خلط ملط Adjustment یا مصالحت Compromize کے مطالبہ ورجحان پر سخت، صاف اور دوٹوک جواب دیا گیا، آگے فرمایا گیا ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔ (نحل:۱۲۵)''اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت، دانشمندی اور عمدہ، دل پذیر وموثر مواعظ کے ذریعہ دعوت دو اور بحث کرنے والوں سے احسن طریقہ سے مباحثہ کرو''۔

اس کے برخلاف تاریخ عالم اور تاریخ مذاہب اور تاریخ اقوام وملل کا مطالعہ کرلیا جائے، تو جتنے بھی تشخصات قائم ہوتے ہیں ان کی تاریخ دوسروں کو مٹانے، دبانے اور کچلنے سے عبارت ہے، کمیونزم کی تاریخ خون سے رنگین ہے، کیپٹلزم کی بھیانک دہشت گردی سے دنیا جوجھ رہی ہے، سیکولرزم کا استبدادی نظام خالق کائنات کے نام کو بھی برداشت نہیں کرتا، ڈیموکریسی کے دوغلے کردار نے ثابت کردیا ہے کہ دنیا میں دو قانون ہیں، ظالم وطاقتور کے لیے جمہوریت میں وہی رعایت ہے جو کتاب الٰہی میں تحریف کرنے والے یہود ونصاریٰ کے یہاں تھی، ان ہی کی طرح قانون کا نفاذ اس جمہوریت میں صرف غریب ومظلوم پر ہوتا ہے، یہود کے خونی اور پرفریب چہرے کو دیکھنا ہوتو ان کا پروٹوکول پڑھ لیجئے اور فلسطین کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے، عیسائیت کے مظالم سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو ماضی کے اسپین اور حال کے عراق، ویتنام وافغانستان کا منظرنامہ دیکھیے اور صرف عیسائی ومغربی مؤرخین کی شہادتوں پر یقین کیجئے، اس کے برخلاف ربانی تشخص کی علمبردار تاریخ کو پڑھیے تو ہزاروں سال کی حکومت کے باوجود بھی دوسروں کو برداشت کرنے، آزادی دینے، حقوق عطا کرنے کے ساتھ ان کو ان کے تشخصات کے ساتھ باقی رکھنا اپنی مثال آپ ہے، خود بھارت کی تاریخ میں طویل مدت تک ایک غالب طاقت ہونے کے باوجود غیروں کی اکثریت ہونا مسلمانوں کے عدل و رواداری اور بقائے باہم کی واضح دلیل ہے۔

اسلامی تشخص کیا ہے، ملة أبیکم ابراهیم هو سمّٰلکم المسلمین من قبل وفی هٰذا۔ (حج:۷۸)''اپنے جد امجد ابراہیمؑ کی ملت کو اختیار کرو، اللہ نے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا ہے، پہلے بھی اسی نام اور وصف سے تم کو متصف کیا تھا، اور اب اس قرآن کے ذریعہ بھی''۔ حنفاء لله غیر مشکرین به۔''اللہ کے لیے یکسو ہوجاؤ اس کے ساتھ شرک نہ کرو''۔ ان الدین عند الله الاسلام۔ (آل عمران:۱۹)''اللہ کے نزدیک نظام حیات اور اطاعت کے طریقے کا نام اسلام ہے''۔ ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین لاشریك له و بذلك أمرت وانا اول المسلمین۔ (انعام:۱۶۲-۱۶۳)''کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو سب کا مالک و پروردگار ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اولین مسلمان ہوں''۔ یہ تفصیل ہے اس اسلامی تشخص کی جو مطلوب ہے، اس کے بعد پھر کسی نظریہ اور کسی ازم کے اعتراف کی گنجائش نہیں رہ جاتی، صاف فرمادیا گیا کہ اللہ کے نزدیک دستور زندگی صرف اسلام ہے، وہ نہ معتدل ہے، نہ غیر معتدل، وہ نہ ماڈریٹ ہے نہ دقیانوس، وہ فطرت سے ہم آہنگ ایسا دستور حیات ہے جس کے آغوش میں پناہ لے کر انسانیت نے تاریخ رقم کی ہے، اس پر رضامندی، اس پر ایمان، اس کا تحفظ اور اس کی سربلندی وحقانیت پر یقین لازمی ہے، خوب یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی صحت پر ایمان کے ساتھ اسلامی تشخص کی بقا اور اس پر مکمل ایمان مکمل نہیں فمن یکفر بالطاغوت و یومن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقی لاانفصام لها والله سمیع علیم۔ (بقرہ:۲۵۶)''لہٰذا جو بھی طاغوت کا انکار کرے گا اور اللہ پر ایمان لائے گا وہ مضبوط حلقہ کو تھام

لے گا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سنتا ہے خوب جانتا ہے''۔ صاف حکم ربانی ہے اور اس حد تک تاکید کے ساتھ فرمایا گیا ہے و لا تموتن الا و أنتم مسلمون۔ (آل عمران:۱۰۲) ''اور تمھیں موت اس حال میں آنی چاہیے کہ تم مسلمان ہو''۔ اس تشخص کے تحفظ کا معاملہ اتنا حساس و نازک ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی آخری وقت میں اپنی اولاد کے متعلق اسی کی فکر ہوا کرتی تھی حضرت یعقوب کی بابت نقل کیا ہے قرآن نے أم کنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت إذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الٰهك واله اٰبائك ابراهيم و اسمٰعيل واسحٰق الها واحدا و نحن لـه مسلمون۔ (بقرہ:۱۳۲) ''کیا تم لوگ اس وقت تھے جب یعقوب کے انتقال کا وقت قریب تھا، جب انھوں نے اپنی اولاد سے کہا تھا کہ میرے بعد کس کی بندگی کروگے؟ تو انھوں نے کہا تھا کہ آپ کے معبود اور آپ کے آباء واجداد ابراھیم و اسماعیل واسحاق کے معبود، ایک معبود کی بندگی کریں گے اور ہم اس کے فرمانبردار (مسلمان) ہیں''۔

اسلامی تشخص قائم ہے اپنے عقیدے، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنے تعلیمی و تربیتی و معاشرتی نظام پر، بھارت میں مسلمان ہزاروں سال سے بستے چلے آرہے ہیں، ان کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے تشخصات کو باقی رکھا، اپنی تہذیب کی حفاظت کی، اسلامی تہذیب ایک ابر کرم کے مانند ہے، اس کے علمبردار دنیا کے جس خطہ میں گئے اپنی شناخت قائم کی، باوجود اس کے کہ صدیوں کی تاریخ رکھنے والی قوموں نے اس تہذیب کو گلے لگا لیا مگر اسلامی تہذیب نے ان کی اصل شناخت کو تبدیل نہ کر کے ان کے اوصاف و خصوصیات کو مزید فروغ دیا، سپاہ گری میں ماہرین کو جذبۂ جہاد عطا کر دیا، فنون لطیفہ کے حاملین کو اسلامیت کا سبق پڑھا دیا، تجارت پیشہ لوگوں کو اسلامی تجارت کے اصول سکھا دیے، گویا سب کو صبغۃ اللہ میں رنگ دیا، جس کے نصیب میں جس قدر تھا اس نے فائدہ اٹھایا، اسلامی تہذیب کا امتیاز یہ تھا کہ اس کے علمبردار پوری دنیا میں اصول و مسلّمات میں یکساں نظر آئے جبکہ علاقائی عادات و اطوار اور رہن سہن میں سب کے یہاں فرق ہونے کے ساتھ ساتھ اقدار مشترک بھی پائی جاتی ہیں۔

اسلامی تہذیب و تشخص کا جادو سر چڑھ کر بولا، دنیا نے اس کے آغوش میں آکر قسمت سنواری، اس کی تاریخ کوئی ڈیڑھ ہزار سال پر محیط ہے، بخاریٰ سے اسپین تک اس تہذیب کے آثار و نقوش نمایاں نظر آتے ہیں، یورپ کی نشأۃ ثانیہ تہذیب اسلامی کی رہین منت ہے، علم جدید کا عروج اندلس و بغداد کے زوال کا نتیجہ ہے، بھارت کے چپہ چپہ پر پھیلے اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں، جو لوگ اپنی کم علمی کے سبب یہاں کے مسلم سلاطین کو صرف عیش کوشی، مقابر کی تعمیر اور علم سے دوری کا دوش دیتے ہیں، وہ ان کی کم علمی یا معاندانہ سوچ کی کرشمہ سازی کے سوا کچھ نہیں، مسلم دور حکومت کا فیضان ہے کہ یہاں کے لوگوں نے کھانے پینے کا ذوق پایا، ملبوسات کا ذوق پایا، فن تعمیر سے واقف ہوئے، نقش و نگار سے متعارف ہوئے، پھولوں کے اقسام، پھلوں کی کاشت، کپڑوں کی صنعت، اسلحہ سازی اور فن سپہ گری مسلم سلاطین ہی کی دین ہے، بھارت نے بین الاقوامی سیاست میں قدم بھی مسلم حکمرانوں کے سبب رکھا، یہاں نظام عدل، قانون کی برتری بھی ان ہی کے عہد میں قائم ہوئی، علم کی سرپرستی کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندی و سنسکرت کی بھی سرپرستی کی، البیرونی کی حوصلہ افزائی کر کے ویدک دھرم اور اس کی تعلیمات اور بھارت کی شناخت کو دنیا میں پھیلانے کا موقع فراہم کیا، ملک میں جس تعلیم کو فروغ دیا اسی تعلیم سے ان کو قاضی ومحاسب، انجینئر اور وزیر اعظم اور صنعت کار و مشیر ملے۔

لیکن پھر وہی ہوا جو تاریخ میں ہوتا آیا ہے، اس تہذیب کا زوال شروع ہوا، یہاں زوال کی کہانی اور اسباب زوال کا بیان دوہرانا مقصود نہیں، زوال ایسا ویسا نہیں ہوا، تہذیب اسلامی کے مراکز سے ہی اس کو دیس نکالا دیا جانے لگا، قوم سیاسی مغلوبیت کے ساتھ ساتھ علمی و فکری اور ذہنی سطح پر بھی مغلوب ہوتی چلی گئی حتی کہ اس نے فکر و نظر اور عقیدہ و نظریہ میں بھی سمجھوتہ شروع کر دیا،

اچھی طرح باور رہے کہ عقیدہ ونظریہ کسی بھی تشخص وتہذیب کی روح واساس ہے، چنانچہ جب اس حد تک بات بڑھ گئی تو پھر اسلامی تشخص کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوا، یہ مسئلہ جب خود تہذیب اسلامی کے گہواروں میں پیدا ہوا تو بھارت میں پیدا ہونا ناگزیر تھا، جہاں تقسیم ملک کے سبب مسلمان دولخت ہو چکے تھے، ایک بھیانک و بدترین تاریخی غلطی نے صدیوں کے لیے بھارت میں انھیں کمزور کر دیا تھا، ایک دفاعی اقلیت کے طور پر رہنے کے لیے مجبور کر دیا تھا، یا تقسیم کی غلطی نہ کی جاتی، یا مکمل تقسیم ہوئی ہوتی تو شاید وہ چیلنجز درپیش نہ ہوتے جو آج ہیں۔

اس ملک کی حکمراں قوم کی حکمرانی ختم ہونے کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان میں تشخص کی بقا کا مسئلہ پیدا ہونا لازمی تھا، بالخصوص تحریک آزادی میں کانگریس نے جس طرح میٹھا زہر پلایا، کانگریس و لیگ سے جو مسائل پیدا ہوئے، جمعیت العلماء جس طرح کانگریس کے ساتھ مل کر تحریک چلانے میں دونیم ہوئی، بلاخر ملک تقسیم ہوگیا، آزادی کے بعد کانگریس کے زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا، کانگریس میں شامل مسلم قیادت بھی رفتہ رفتہ بات سمجھ گئی، لیکن وہ اپنی مجبوری کے پیش نظر دفاع وتقلید کے سوا کچھ نہ کرسکی، نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ مسلمانوں میں مایوسی عام ہونے لگی، فسادات کا سلسلہ پھوٹ پڑا، حالات ایسے پیدا ہوئے جن سے اچھے اچھے لوگ حواس باختہ ہوگئے، قوم انتہائی نازک حالات میں پہنچ گئی، جہاں اپنی نسل کے ایمان وعقیدے کے تحفظ کا مسئلہ تھا، مذہبی تشخصات کا مسئلہ تھا، زبان کا مسئلہ تھا، فکری ارتداد سے نئی نسل کو بچانے کا مسئلہ تھا، قوم کو تعلیمی اور معاشی اعتبار سے اپنے پیڑوں پر کھڑا کرنے کا مسئلہ تھا، ضرورت تھی کی اس صورت حال میں ''جلوۂ دار ورسن'' کو دعوت دینے والا ''آوازۂ منصور'' بلند ہو، بے لاگ نظریہ کا اعلان ہو، سیاست وبصیرت کے ساتھ قوم کی کشتی کو منجدھار سے نکالا جائے، دار ودرسن کی پروا کیے بغیر ایک نتیجہ خیز مہم کی داغ بیل ڈالی جائے، ایک ایسی تعلیمی وسیاسی فکر کو عام کیا جائے جس میں اسلامی تشخص کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ معاشی ترقی کا راز مضمر ہو، مگر بدقسمتی کہ ایسا نہیں ہوا، جمعیت العلماء نے قیادت کی کمان سنبھالی مگر ہم آج اسی دور بلکہ اس سے بدترین دور میں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے ۱۹۴۷ء میں سفر شروع کیا تھا، ہماری اکثریت فکری ارتداد میں مبتلا ہے، سیکولرزم کے بھوت نے ہم کو قرآنی حقائق تک سے غافل کر دیا ہے، تعلیمی شتویت نے ہمارے ایک طبقہ کو خودغرض تو دوسرے کو مفلس ومعذور بنا دیا ہے، قیادت دم توڑ چکی ہے، سیاسی وجود غیر موثر ہوتے ہوتے اب بالکل بے قیمت ہو چکا ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ بدرجہ مجبوری کسی نظریہ سے طبعی وقلبی تنفر کے ساتھ سمجھوتہ (Adjustment) تو ممکن ہے، مگر اپنے نظریہ سے دستبرداری، بدون شرط مصالحت وحمایت اور بغیر وضاحت کے قبول وتسلیم اور باطل نظریہ کی تبلیغ کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو آج ہم ملک کے طول وعرض پر بکھری اپنی نئی نسل میں دیکھ رہے ہیں، سیکولرزم کے ساتھ ہمارا معاہدہ رفتہ رفتہ ہمارا ہدف بن گیا، وضاحتیں ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوگئیں، شرائط ذہن سے محو ہوگئیں، آج یہی ہمارے لیے طریقۂ زندگی اور ہدف اصلی بن گیا، ہم اسی کو اپنا تشخص سمجھ بیٹھے۔

اس ملک میں مسلمانوں کو اپنے تشخصات کی حفاظت کے لیے کس طرح سوچنا چاہیے اس کے لیے ہم ایک مخلص قائد اور بے باک صحافی قاضی عدیل عباسی کے دو بے لاگ اقتباس پیش کرتے ہیں جنھوں نے اس پرآشوب دور میں یہ آوازۂ حق بلند کیا تھا مگر افسوس کہ اس وقت کی قیادت نے ان کی بات پر کان نہ دھرا، اور پھر جب انھوں نے ایک مضبوط تعلیمی تحریک برپا کی تو ایک طبقہ نے ان کو ناکام کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، قاضی صاحب نے لکھا تھا:

''ہم نے جمہوریت کو بطور پالیسی بالکل اسی طرح تسلیم کیا ہے، جس طرح ۱۹۲۰ء میں عدم تشدد کو، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم اسلام کے بنیادی عقائد سے دستبردار ہو جائیں گے، ہندستان کے دستور اساسی کی حیثیت ایک ایسے معاہدے کی ہے، جو مختلف قوموں کے درمیان ہوا اور

اس کی دفعہ ۲۹، ۳۰ واضح طور پر یہ حق دیتی ہے کہ ہم اپنے مذہب پر پوری آزادی سے عمل کرسکیں، ہم پھر بتادینا چاہتے ہیں خدا، اس کے رسول اور قرآن سے ہماری وفاداری پہلے ہے اور دستور کی وفاداری دوسرے درجہ کی، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ ہم حکومت کے وفادار رہیں، مسلمانوں سے اس قسم کے مطالبات جو انہیں اسلام ہی سے خارج کردیں، دستور میں دیے ہوئے حقوق سے بغاوت ہے۔'' (تحریر بے عدیل، ص ۲۳۴)

انھوں نے مومنانہ فراست وبصیرت کے ساتھ یہ جرأت مندانہ اعلان کیا تھا ''ضرورت ہے کہ ہم اس نازک موقع پر اپنا موقف واضح کردیں، اور جہاں یہ ظاہر کریں کہ ہم ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں اور ہندستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں وہاں یہ بھی بتلادیں کہ ''ہم ایک قوم اور ایک کلچر'' کے نظریہ کو اپنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں، ہم ایک ایسے عالمگیر تہذیبی سرمایے کے وارث ہیں جو اپنے اندر سب کچھ رکھتا ہے اور جو پروانے کی صفت نہیں رکھتا، جو روشنی کا جویا ہو، بلکہ جگنو کی طرح ہے جو سراپا روشنی ہے، اس لئے ہم طواف شمع سے آزاد ہیں اور اپنی فطرت کے تجلی گاہ میں آباد رہنے کو ضروری تصور کرتے ہیں، ہمیں ہر قیمت پر اپنی اسلامی تہذیب کو وطن دوستی اور قوم پروری کی پوری پابندی کے ساتھ زندہ رکھنا ہے، مگر طوفان اتنا تیز، بادِ مخالف کے جھونکے اتنے سخت اور گرادب بلا کا اتنا زور ہے کہ اس کے قیام کے لئے ہمیں بہت پختہ عزم اور نہایت دانشمندانہ شعور پیدا کرنا ہوگا۔'' (الفرقان مئی ۱۷ء ص ۱۳)

اب حالات مزید خراب ہو چکے ہیں، اب تو جس دستور کے حوالے سے ہم اپنے تشخصات کی حفاظت کا دم بھرتے ہیں اس کو بھی بدل ڈالنے کی تیاری ہے بلکہ ہماری شہریت تک سلب کرلینے کا عزم ہے جو از خود ارتداد کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے، اس صورت حال میں ضرورت ہے کہ مفادات سے دور، تکلفات سے عاری مخلص قیادت سامنے آئے، سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھنے والے اپنے موقف پر غور کریں، اقبال کی اس بصیرت کو سمجھ لیں جس کا اظہار انھوں نے دہائیوں پہلے کرتے ہوئے کہا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مسلمان اس ملک میں کیسے اپنے تشخصات کو باقی رکھ سکتے ہیں، اس تکثیری معاشرے میں وہ اپنی تہذیب کا کس طرح تحفظ کرسکتے ہیں، یہ عمل کیوں ضروری ہے، وہ اپنے اختلافات کو کس طرح اتحاد میں تبدیل کرسکتے ہیں، یہاں کے سماج میں انھیں کس طرح کے چیلنجز کا سامنا ہے اور وہ ان سے کس طرح نمٹ سکتے ہیں، دستور ہند ان کے لیے کس قدر معاون ہے اور اس میں انھیں کس قدر آزادی حاصل ہے، اسلام نے انسان کو کیا حقوق دیے ہیں، حقوق انسانی سے متعلق اس کا تصور کتنا جامع، کیسا اعلیٰ اور مثالی ہے، ان تمام سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں اس کتاب میں جو گرامی قدر محترم ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صاحب کے قلم فیض رقم سے وجود میں آئی ہے، انھوں نے ان سب پہلوؤں پر مفکرانہ و دانشمندانہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے، فہیم اختر صاحب کا نام نامی سنجیدہ اہل علم میں احترام سے لیا جاتا ہے، سنجیدہ علمی وفکری مباحث میں ان کا قلم اپنی شناخت قائم کرچکا ہے، یہ کتاب جوان کے مختلف مقالات پر مشتمل ہے، دراصل ان کے سوزِ دروں، ملت کے تئیں تڑپ، وسعت مطالعہ اور فکری بصیرت کی غماض ہے، انھوں نے اس میں نہ صرف مسائل پیش کیا ہے اور شکوہ وشکایات سے کتاب کو بوجھل کیا ہے بلکہ حل پیش کیے ہیں، اس میں راز ہیں، اور ان رازوں سے پردے اٹھائے گئے ہیں، رہنمائیاں ہیں، مسائل سے نمٹنے کے طریقے ہیں، زوال کو عروج میں بدلنے کے نسخے ہیں، مختصراً کہا جائے تو اس کتاب میں موضوع کتاب پر گفتگو کے لیے انھوں نے اپنی قرآن فہمی، حدیث نبوی سے استفادہ، تاریخ کے مد و جزر اور معاصر دنیا سے واقفیت کے سبب قوم مسلم کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے آسان حل پیش کیے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ایسی سنجیدہ اور فکری تحریروں کی بڑی قلت ہے جن میں معاصر دنیا کی رعایت کے ساتھ ساتھ پختہ و شفاف اور غیر جانبدار اسلامی شعور کی نمائندگی ہو، جماعتی تعصب، گروہ بندی، شخصیت پرستی، غیر علمی مزاج، مناصب کی ہوس اور مفاد پرستی نے اس قوم کو لخت لخت ہی نہیں صد لخت کر دیا ہے، اتحاد کی ہر آواز کے بعد اختلاف کی نئی خلیج پیدا ہو جاتی ہے، اختلافات کو ختم کرنے کا نعرہ ہی سرے سے لاعلمی اور غیر دانشمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے، اختلاف فطری ہے، ہمیشہ سے ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا، اختلاف کو برداشت کرنے سے اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، اس ضمن میں فہیم صاحب نے انتہائی ہوشمندانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے، اب ضرورت ہے ایسی تحریروں کو عام کرنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی، یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب تک ہماری قوم کا سیاسی شعور بیدار نہ ہو، اور یہ حقیقت تسلیم نہ کر لے کہ ایک ایسی قوم و ملت ملک کی جمہوریت و سیاست سے کیسے دور رہ سکتی ہے جس کا دین پوری زندگی کو محیط ہو اور مذہب بندہ اور خدا کے درمیان تفریق کا زبردست منکر ہو، یہ کہنے والوں کے حوصلے توڑتا ہو کہ میں مذہبی ہوں سیاسی نہیں، پھر مخلص قیادت کھڑی نہ ہو، بے لوثی و بے نفسی کا مظاہرہ نہ ہو، اقربا پروری اور خاندان واد ختم نہ ہو، نظام تعلیم کی ثنویت و تقسیم ختم نہ کی جائے اور یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ امت دین و دنیا کی بنیاد پر قائم الگ الگ نظام تعلیم سے کبھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑی ہو سکتی، اس حقیقت کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ آیات قرآنیہ میں تدبر کا حق تبھی ادا ہو سکتا ہے جب کہ آیات کونیہ میں بھی تدبر کر کے دونوں کے درمیان توازن قائم کیا جائے، خلافت ارضی کا راز سمجھنے کے لیے اس راز کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، جب تک یہ سب نہ ہوگا اور أفتومنون ببعض الكتاب و تكفرون ببعض۔ (بقرہ:۸۵) کے نقوش کو نہیں مٹایا جائے گا تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو"۔ تب تک ایسی بلکہ اس سے بھی زیادہ رہنما تحریریں اس قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتیں، ضرورت ہے کہ ایسی تحریروں سے فائدہ اٹھایا جائے، قوم کے سیاسی شعور بیدار کیا جائے، طرز کہن کو خیر باد کہہ کر فکر نو کی تشکیل کی جائے، زمانے کی زد میں آ کر نابود ہونے سے پہلے اپنے قلعہ کو مضبوط تر کر لیا جائے، نسلِ نو کو ذہنی طور پر مسلمان بنانے کی تگ و دو کی جائے، فرسودگی اور روایت پرستی سے قطعِ نظر اسلام کی آفاقیت و وسعت کی دعوت کو تحریک بنایا جائے، اپنے تشخص کا اظہار اس قوت کے ساتھ کیا جائے کہ وہ خود ہی غیروں کے لیے باعث کشش بن جائے، عقیدہ کی پختگی اور اس پر استقامت، امانت دارانہ سیاست، غیر منقسم نظام تعلیم اور اختلاف کو برداشت کرتے ہوئے اتحاد و باہمی تعاون کے ساتھ مذہبی رواداری اور اسلام کی وسعتوں کا صحیح تعارف ہمارے تشخص کا محافظ و ضامن ہے۔

ڈاکٹر فہیم اختر صاحب جیسے معروف صاحبِ قلم و دانشور کی کسی کتاب پر میرے ایسے کم علم و نا اہل اور بے مایہ مبتدی کا کچھ لکھنا نہ صرف باعث حیرت و استعجاب ہے بلکہ خلافِ عقل بھی، مگر یہ بھی ان کی خورد نوازی، اندازِ تربیت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اس پُر مغز اور فکری کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لیے اس طالب علم کا انتخاب کر کے استفادے کا موقع فراہم کیا، اس کتاب پر مقدمہ لکھنا واقعہ یہ ہے کہ خود میرے لیے باعث سعادت ہے، سچی بات یہ ہے کہ گذشتہ ۱۲/ سال سے مسلسل ملک و ملت کے حالات اور اس طرح کے موضوعات پر کچھ نہ کچھ اظہار خیال کرتا رہا ہوں، باجود اس کے اس کتاب کے مطالعہ سے نئے در تیچے وا ہوئے، پڑھتے پڑھتے کئی مقامات پر نئے زاویے سے سوچنے کا موقع ملا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مفید و نافع بنائے اس کا نفع عام فرمائے، ہمارے قومی زوال کو عروج میں بدلنے کا ذریعہ بنائے، مصنف کو عمر خضر عطا فرمائے تا کہ ان کا فیض جاری رہے، اور ان کے قلم کے فیضان سے نسل نو سیراب ہوتی رہے۔

وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت و إليه أنيب۔

(مقدمۂ کتاب: "ہندوستانی مسلمان اور اسلامی تشخص"
مصنفہ: ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی)

☆☆☆

□ تذکرہ وسوانح

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اعترافات کی روشنی میں

مولانا طلحہ نعمت ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل وکمالات اور خصوصیات کا اعتراف واقرار ان کے معاصرین اور ممتاز اہل علم نے دل کھول کر کیا ہے، ان کے اساتذہ ومشائخ اور بزرگوں نے بھی ان کے متعلق بلند کلمات کہے ہیں، لیکن اگر باکمال شاگرد کو اس کے عظیم المرتبت استاد کا اعتراف اور کلمات تحسین وآفریں اور تہنیت وتبریک کم عمری ہی میں حاصل ہوجائے تو پھر اس کی عظمت کا کیا کہنا، بالخصوص جب کہ استاد خود بہت عظیم ہو اور ابتدائے عہد میں ہی شاگرد کے کمالات کا اعتراف کرلے۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت مولانا کے استاذ ومربی اور بزرگ تھے، انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں حضرت مولانا کے کمالات کا اعتراف کیا ہے، ان اعترافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید صاحب نے اس جوہر قابل کو بہت پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ حضرت مولانا کے متعلق سید صاحب کے متعدد اعترافات اور بلند کلمات ہیں جن سے اہم علم پوری طرح واقف نہیں، اس مضمون کے ذریعہ ان کے تحریروں کو پیش کرنا اور ان کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے، تاکہ حضرت مولانا کے کمالات کا ایک اور پہلو سامنے آسکے۔

سید صاحب نے حضرت مولانا کے نام خطوط میں بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور دیگر تحریروں میں بھی، جو گرچہ عام ہیں لیکن ان کی طرف اس پہلو سے کم توجہ کی گئی ہے اس لئے یہاں ان کا تذکرہ یا ان کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا۔ ان میں قابل ذکر سید صاحب کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے حضرت مولانا کے نام لکھے ہیں اور حضرت مولانا کتاب پرانے چراغ میں میں سید صاحب کے حالات میں حضرت مولانا نے انہیں درج کیا ہے، بعض خطوط میں ان کی انشاء پردازی کی داد دی گئی ہے۔

سید صاحب کا حضرت مولانا کے متعلق سب سے بلند اعتراف سیرت سید احمد شہید پر ان کے مقدمہ میں دیکھنے کو ملتا ہے، جو خود بقول مصنف نے سید صاحب نے دل کھول لکھا ہے، مقدمہ سید صاحب کے معمول کے خلاف بہت طویل ہے، اس میں مصنف کی کوششوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اخیر میں سید صاحب نے لکھا ہے: ''مصنف نے یہ کتاب بڑے وقت سے لکھی ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں عزم وہمت کا صحیفہ دے دیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مسلمان اس تاریخی موقع پر اس کتاب سے اصلاح وہمت کا فائدہ اٹھائیں، اور اپنے ماضی کے آئینہ میں اپنی مستقبل کی شکل وصورت دیکھیں''۔ (۱/۳۹ مطبوعہ لکھنؤ ۲۰۱۱ء۔)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سید صاحب نے سیرت سید احمد شہید کی اشاعت کے بعد اس پر اپنی رسالہ معارف کے شذرات میں جامع تبصرہ بھی کیا تھا اور لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا:

''۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامہ سے کچھ پہلے

ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک مجاہدین کا جو گروہ پیدا ہوا تھا اور اس گروہ نے ہندوستان میں اسلامی عقائد واعمال کی اصلاح کا جو کام کیا تھا اس کی پوری تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی تھی، اور جو لکھی گئی تھی وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بہت دور تھی۔ اس کمی کو محسوس کر کے ہمارے نوجوان ندوی فاضل مولوی سید ابوالحسن علی صاحب مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے جو اسی خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں بڑی تحقیق اور محنت سے سیرت سید احمد شہید کے نام سے ایک نہایت دلچسپ روح افزا اور ایمان پرور کتاب لکھی ہے، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں کے سیاسی ذوق کو سمجھنا چاہتے ہیں اس کتاب کو پڑھیں اور ماضی کی یاد سے مستقبل کا فائدہ اٹھائیں''۔ (شذرات سلیمانی، ص ۲۰۵ مئی ۱۹۳۹ء)

مولانا سید عبدالحی صاحب کی وفات پر معارف میں جو مضمون لکھا گیا تھا اس کو یادرفتگاں میں ترتیب دیتے وقت حضرت مولانا کا تذکرہ حاشیہ میں ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

''مرحوم کے دوسرے صاحبزادے جو دوسری بیوی سے ہیں اس وقت بہت ہی کم سن تھے، اس لئے اس وقت ان کا ذکر نہ کیا جاسکا، آج وہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور روزگار ہیں، اور تبلیغ کے کام میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں، دو تین سال سے حجاز میں دعوت کے کاموں میں لگے ہیں، امسال حجاز اور مصر کی فضائیں ان کے نغموں سے معمور ہیں، اللہ تعالیٰ نے عربی تحریر وتقریر کی دولت ان کو عنایت فرمائی ہے جس کو وہ بحمد اللہ دین کی راہ میں لٹا رہے ہیں'' (ص، ۴۶)

حضرت مولانا کی مشہور کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین جس نے دنیا کے اہل علم سے زبردست خراج تحسین وصول کیا ہے، اس کا اردو ترجمہ خود حضرت مولانا نے اپنے قلم سے کیا تھا او ''رمسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' کے عنوان سے اصل عربی سے پہلے ہی شائع کتاب ہندوستان میں شائع ہوگئی تھی، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سید صاحب نے اسی وقت مطالعہ کے بعد اس کتاب کو خراج تحسین پیش کیا تھا اور اپنے شاگرد کو اس کاوش کی داد دی تھی اور اہل علم کو اس سے روشناس کرایا تھا، اس کتاب کے دیگر عالمی اعترافات کے ساتھ اگر سید صاحب کی شہادت اور ان کے جامع تبصرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس کی عظمت مزید اجاگر ہوگی، لکھتے ہیں:

''رجوع الی الاسلام کی بعض تحریکیں اس وقت قائم ہیں، اور جس طرح فضا کے تغیر سے موسم کا حال معلوم ہوسکتا ہے اسی طرح ان تحریکوں کی وسعت رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاس وقنوط کے بعد ابر رحمت کا فیض درافشانی کو آمادہ ہے، ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے اختلاف رہنے کے باوجود اصل متفقہ مقصد پر سب متفق رہیں، .....اس سلسلہ میں ابھی ہمارے نوجوان عزیز مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی کتاب ''اسلام کے زوال سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچا'' شائع ہوئی ہے، انہوں نے دل کی دردمندی کے ساتھ زبان کی تاثیر بھی پائی ہے، اس لئے یہ وقت ہے کہ ان کی کتاب زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے، اور سمجھی جائے اور اس طرز پر احیائے دین کی خدمت شروع کی جائے''۔ (شذرات سلیمانی)

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''ندوہ کے بعض حضرات مدرسین اور ان میں سے برادر عزیز ومحبوب مولانا ابوالحسن علی سلمہ اللہ تعالیٰ ورفع شانہ (حضرت مولانا سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے چھوٹے صاحبزادے) جن سے ہماری بڑی بڑی توقعات قائم ہیں مولانا کاندھلوی کے اوصاف جمیلہ اور ان کی دعوت کے مقاصد ومہمات کے گرویدہ تھے''۔ (ص ۳۳۵ شذرات سلیمانی، مطبوعہ ۱۹۹۸)

☆☆☆